قرآن کریم

کا مقدمہ اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر

افادات
حکیم الاسلام امام انقلاب
مولانا عبیداللہ سندھیؒ
از
شیخ الاسلام
حضرت مولانا محمد مدنی

حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ

ویب : www.hikmatequran.org ای میل : hikmatequran@gmail.com

قرآن کریم کا مقدمہ اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر
حکیم الاسلام امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ

اشاعت اول: اپریل 2008ء
طابع: ذکی سنز پرنٹرس کراچی
ناشر: حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ کراچی

ایڈریس:
حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ
6- سندھی جماعت کوآپریٹو سوسائٹی، جوگی موڑ بس اسٹاپ
نیشنل ہائی وے کراچی۔ 75030
رابطے کیلئے 021-4213117
ویب: www.hikmatequran.org
ای میل: hikmatequran@gmail.com

فہرست مضامین

قرآن شریف کا مقدمہ 5
- نبی کس کو کہتے ہیں؟ 5
- اللہ والوں کے اقسام 5
- سب سے بڑا نبی کون ہے؟ 6
- نبیوں کو انبیاء بنا کر کیوں بھیجا جاتا ہے؟ 6
- رسول ﷺ اللہ کو نبی بنا کر بھیجنے کی حکمت 7
- رسول اللہ ﷺ کے وقت میں ملک کی حالت اور آپ نے اسے کیسے بدلا؟ 8
- رسول اللہ ﷺ کی شریعت کا اصل مول متہ کیا تھا؟ 9
- رسول اللہ ﷺ نے دنیا کی اقوام تک دین حنفی کی کیسے تبلیغ فرمائی؟ 10
- دین حنفی کی دوسرے ادیان سے برتری 10
- ابراہیم علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے امام کا خطاب کیوں ملا؟ 11
- حنفی ملت کی اصلی روح 11
- یہودی اور عیسائی اگرچہ حنفی ملت کی شاخیں ہیں لیکن انہوں نے اس کی پوری تبلیغ نہیں کی۔ 11
- حنفی ملت کی پوری پوری تبلیغ کون کریگا؟ 13
- عیسیٰ علیہ السلام کی پیشنگوئی کہ حنفی دین کی پوری تبلیغ رسول اللہ ﷺ کریں گے 14
- رسول اللہ ﷺ کے نبی ہو کر آنے کا اصلی مقصد 15
- رسول اللہ ﷺ کا اپنے مقصد میں کامیاب ہونا 15
- رسول اللہ ﷺ اللہ کی تعلیم کا خلاصہ 18
- شعائر اللہ کی حقیقت 20
- عدالت کی وضاحت 22
- پہلی بات انسان کی حقیقت کیا ہے 22

ویب : www.hikmatequran.org ای میل : hikmatequran@gmail.com

- رسول ﷺ اللہ کی کوئی بھی تعلیم انسانی فطرت کے خلاف نہیں ہے 23
- انسان کی تشریح اور اس کے مختلف مقامات میں مختلف مرتبے اور اس کے اچھے اعمال کا بیان۔ 24
- رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کا خلاصہ 27

تفسیر سورۃ الفاتحہ 29
- سورۃ فاتحہ کے مختلف نام اور ان کی مختصر تشریح 29
- اس سورت کا حاصل مطلب 29
- نبوت کے درجات 31
- ایک علمی بحث 32
- ایک مثال 33
- عام تاریخ دانوں کی غلط فہمی 33
- ایک اعتراض اور اس کا جواب 34
- ان دونوں صفتوں کے بیان کرنے کا فائدہ 36
- اللہ کی رحمت کے بعد اختلاف پیدا ہونے کی مثال 37
- خدائی فیصلہ کا فائدہ 38
- حقیقی توحید کا بیان 40
- دعا کی ضرورت 42
- وہ کونسی جماعت ہے، جس کے راستے پر چلنے کی ہم دعا مانگ رہے ہیں 42
- ہمارا اس دعا مانگنے سے مطلب کیا ہے؟ 43
- اس دعا کا نمونہ 44
- خاتمہ سورۂ فاتحہ 46
- نماز کی حقیقت 47
- نماز پڑھنے کے وقت سورۃ فاتحہ کے معنی کی طرف خیال کرنے کی آسان صورت 48

b

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن وَالصَّلٰوۃ وَالسَّلَام عَلیٰ سَیِّدالمرسَلیْنَ
وَعَلیٰ اٰلِہ وَاَصْحَابِہٖ اَجمعِیْن

قرآن شریف کا مقدمہ

نبی کس کو کہتے ہیں؟

جاننا چاہئے کہ مفہمین (یعنی وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہی کی حقیقت سمجھائی ہے) کے بہت سے اقسام ہیں اوران کی لیاقتیں اور قابلیتیں بھی جدا جدا ہیں۔ انہی میں سے اللہ تعالیٰ نوعِ انسان کے لئے رہبر اور رہنما مقرر کرتا رہتا ہے۔ جب اللہ کی حکمت یہ چاہتی ہے کہ ان میں سے ایک کو اپنی مخلوق کی طرف بھیجے اور اس کو لوگوں کے تاریکی میں سے نکال کر روشنی کی طرف آنے کے لئے سبب بنائے تو لوگوں پر یہ فرض کرتا ہے کہ دل اور جان سے اس کی تابعداری کریں اور اسی کے لئے اس دنیا سے باہر کی مخلوق یعنی ملائکہ کی اُونچی جماعت میں یہ تجویز پاس کی جاتی ہے کہ جو آدمی اس کی تابعداری کرے گا اس سے ملائکہ راضی ہوں گے اور جو اس کی مخالفت کرے گا اس کے دشمن ہو جائیں گے اور اس پر لعنت کرتے رہیں گے۔ جب اللہ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے تب اللہ تعالیٰ اس دنیا کے رہنے والے انسانوں کو اس بات کی خبر دیتا ہے اور ان پر اس بھیجے ہوئے انسان کی تابعداری کرنا لازم ٹھہراتا ہے۔ اس بھیجے ہوئے بزرگ کو جس کی تابعداری کرنا لوگوں پر لازم ہے نبی کہا جاتا ہے۔

فائدہ ۲- اللہ والوں کے اقسام

اوپر گزر چکا ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہی کی حقیقت سمجھائی ہے ان کے بہت سے اقسام ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی کامل ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کی حقیقت سمجھنے میں کمال کو پہنچ چکا ہے۔ یہی نبی کی شان ہے) کوئی حکیم ہے (یعنی اللہ کی بادشاہی میں جو حکمت رکھی ہوئی ہے وہ اس کو سمجھتا ہے) کوئی ''مؤیّد بروح القدس'' ہے (یعنی انسانیت کو کمال تک پہنچانے کے لئے جو کام اس پر رکھا ہوا ہے یا اس نے اپنے اوپر لیا ہے اس میں اس کی مدد روح القدس سے ہوتی رہتی ہے) کوئی لوگوں کو راستہ دکھانے والا ''ہادی'' اور ان کو پاک کرنے والا ''مزکی'' ہے کوئی امام (یعنی قوموں کا رہنما) ہے۔ کوئی مُنذِر (یعنی کاموں کے نتائج کی پہلے سے خبر دینے والا) ہے۔

ویب : www.hikmatequran.org ای میل : hikmatequran@gmail.com

فائدہ ۳۔ سب سے بڑا نبی کون ہے؟

انبیاء میں سب سے بڑی شان والا وہ نبی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کی قوم کے ساتھ دوسری اقوام کی طرف بھی نبی بنا کر بھیجا ہو۔ پھر وہ نبی اپنی قوم کو اندھیروں میں سے روشنی کی طرف نکالنے کا سبب ہوگا (۲) اور اس کی قوم دوسرے اقوام کی رہنما بنے گی۔ یہ دونوں باتیں محمد رسول اللہ ﷺ میں موجود ہیں پہلی بات کی طرف سورۂ جمعہ کی دوسری اور تیسری آیت میں ارشاد ہے ان دونوں آیتوں کے معنیٰ یہ ہیں ''اللہ وہ ہے جس نے انپڑھوں میں ان میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور بیشک وہ اس سے پہلے ظاہر گمراہی میں تھے اور ان میں سے دوسروں کے لئے بھی (اس کو بھیجا ہے) جو اب تک اُن (پہلوں) سے نہیں ملے اور وہ زبردست حکمت والا ہے۔'' دوسری بات کی طرف سورۃ آل عمران کی اک سو دسویں آیت میں اشارہ ہے، اس آیت کے معنیٰ یہ ہیں ''تم اچھے کام کا حکم کرتے ہو اور برے کام سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔ اگر کتاب والے ایمان لاتے تو ان کے لئے بہتر تھا۔ کچھ ان میں سے ایمان والے ہیں اور بہت سے ان میں سے نافرمان ہیں۔'' اور مندرجہ ذیل احادیث میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے۔

☆ حدیث: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو (لوگوں کے لئے) آسانی پیدا کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور ان پر تنگی کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا) یعنی اُمتِ محمدی کے افراد بھی انسانوں کی ہدایت کے لئے اس طرح بھیجے ہوئے ہیں جس طرح انبیاءؑ کو بھیجا جاتا ہے)

علاوہ اس کے رسول اللہ ﷺ میں علم کے وہ سب اقسام موجود تھے جو جدا جدا ان لوگوں میں موجود ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہی کی حقیقت سمجھائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے جو انبیاء تھے ان میں سے کسی کو ایک قسم کا علم تھا۔ کسی کو دو قسموں کا۔ لیکن علم کے تمام اقسام رسول اللہ ﷺ کے سوا دوسرے کسی میں بھی نہ تھے (یعنی انبیاء، حکماء اور جن کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی ہے۔ رہنما اور اماموں کے جتنے بھی جدا جدا علم ہیں، علم کے وہ سب اقسام ہمارے نبی کو حاصل ہیں)

فائدہ ۴۔ نبیوں کو انبیاءؑ بناکر کیوں بھیجا جاتا ہے؟

یہ بھی جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت رسولوں کو بھیجنے کی تب خواہش کرتی ہے جب

رسولوں کے بھیجنے میں کسی قسم کی بھلائی ہو۔ اس بھلائی کو اللہ غیب دان کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔ لیکن بعض اسباب ایسے بھی ہیں جن کو ہم بھی جانتے ہیں۔ وہ اسباب رسولوں کے بھیجنے کے وقت ضرور پائے جائیں گے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ وقت کسی نئی حکومت کے ظاہر ہونے اور پہلی حکومت کے برباد ہونے کا ہوگا۔ پھر اس وقت اللہ تعالیٰ ایسا رسول بھیجے گا جو اس نئی حکومت کا دین یا قانون قائم کرے گا۔ اور پرانی حکومت برباد ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سردار محمد ﷺ کو اس کام کے لئے نبی بنا کر بھیجا ہے۔ کہ قیصر و کسریٰ کی سرمایہ دارانہ اور ظالمانہ حکومتوں کو مٹا کر خلافت الٰہی کی عادلانہ حکومت قائم کیجائے۔

فائدہ ۵۔ رسول اللہ ﷺ کو نبی بنا کر بھیجنے کی حکمت

جب ہر قوم کا دین اور دھرم جدا ہو گیا اور ہر ایک قوم نے خاص طریقے اختیار کر لئے اور ان رسومات اور طریقوں کو قائم رکھنے کے لئے دوسری قوموں کے ساتھ پہلے زبان کے ساتھ انہوں نے جھگڑے کئے اور اس کے بعد اپنے مخالفین پر غالب آنے کے لئے اپنے ہتھیار اُٹھا کر ان سے جنگ بھی کی اور ان میں ظلم پھیل گیا۔ اور کتنے کام جو ان کو کرنے تھے ان کو انہوں نے چھوڑ دیا۔ اور ہر جماعت نے دوسری جماعت پر لعنت کی۔ اور ان کو برا سمجھ کر ان کے ساتھ جنگ جاری رکھی اور قوموں کے آپس میں جھگڑے کے سبب حق چھپ گیا۔ تب ایک راہِ راست پر چلنے والے امام یا پیشوا کی ضرورت پڑی جو تمام جماعتوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرے جیسا حق پر چلنے والا الخلیفہ (اللہ کا نائب) ظالم بادشاہوں کے ساتھ کرتا ہے (یعنی یہ پیشوا مختلف جماعتوں کو ملا کر ان کو ایک جماعت بنائے گا)۔ یہ امام (پیشوا) جو جدا جدا جماعتوں کو ملا کر ایک جماعت بنائے گا اس کو چند اصولوں پر چلنا ہوگا۔ ان اصولوں میں سے پہلا اصول یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہِ راست کی طرف بلائے گا۔ اور اُن (کے اخلاق) کو پاک کرے گا اور ان کی حالت درست کرے گا۔ اس کے بعد ان سے ایسا کام لے گا جیسا اپنے اعضاء سے لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ ان کو لوگوں کی ہدایت کے لئے جدا جدا ملکوں میں بھیج دے گا۔ اور سیدھے راستے پر نہ چلنے والی دُنیا سے جنگ بھی کرے گا۔ یہ تیسرے فائدہ میں بیان کی ہوئی آل عمران کی آیت ۱۱۰ کے معنیٰ ہیں۔

اس پہلے اصول پر امام کو اس لئے چلنا پڑے گا کہ اس اکیلے امام (پیشوا) سے دنیا کی بے شمار جماعتوں کے ساتھ مقابلہ نہ ہو سکے گا۔ اور گمان بھی یہ ہے کہ سیدھے راستے پر چلانے کے لئے جنگ کے بڑے ساز و سامان اور پوری فوج کے سوا (جن کے حاصل کرنے کے لئے نبی (امام) کی عمر کافی نہیں ہے) وہ دوسری جماعتوں کی تابعداری قبول نہیں کرے گی جیسے کہ اس

وقت کے موجودہ ادیان والوں (یہود، عیسائی اور مسلمانوں) کے شروع زمانہ میں ہوا۔ کیونکہ ان میں سے جو لوگ ابتدا میں اپنے اپنے انبیاءؑ پر ایمان لائے وہ بالکل تھوڑے تھے۔ اس نبی کے بعد وہ آہستہ آہستہ طاقت ور ہوئے اور اقوام کی ہدایت کا سبب بنے اور حق کے لئے انہوں نے لڑائیاں کیں۔

فائدہ ٦۔ رسول اللہ ﷺ کے وقت میں ملک کی حالت اور آپ نے اُسے کیسے بدلا؟

جن ملکوں کی آب و ہوا معتدل ہے (جس کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کا مزاج بھی معتدل ہے) وہ ملک رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے کے وقت دو بڑے بادشاہوں کے قبضہ میں تھے۔

۱۔ کسریٰ (ایران کا بادشاہ) جس کا عراق۔ یمن۔ خراسان اور ان ملکوں کے اردگرد والے ملکوں پر قبضہ تھا، ماوراء النہر سندھ اور ہندوستان کے بادشاہ بھی اس کے ماتحت تھے اور ہر سال اس کو خراج دیتے تھے۔

۲۔ قیصر (روم یا یورپ کا بادشاہ) جس کا شام، روم اور ان ملکوں کے اردگرد والے علاقوں پر قبضہ تھا۔ مصر، مغرب اور افریقہ کے ملک بھی اس کے ماتحت تھے اور ہر سال اس کو خراج دیتے تھے۔ پس ان دونوں بادشاہوں کو شکست دینے اور ان کے ملکوں پر غالب آنے کے یہ معنیٰ ہوں گے کہ جس نے ان کو شکست دی اس کا تمام پر غلبہ ہو گیا (اُمتِ اسلامیہ نے خلیفہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ان دونوں حکومتوں کو فتح کر کے گویا روئے زمین کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس کے علاوہ ان دونوں بادشاہوں کی عیش و عشرت کی عادات ان کے ماتحت ملکوں میں پھیل گئی تھیں پس ان عادات کے بدلنے اور ان عادات سے لوگوں کو روکنے کے یہ معنیٰ ہوں گے کہ گویا تمام ملکوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ ان عادات کو چھوڑ دیں (ورنہ ان پر تباہی آئے گی)

لیکن جن ملکوں کی آب و ہوا اور وہاں کے لوگوں کا مزاج معتدل نہیں ہے ان کا انسانی نوع کی اصلاح میں کوئی خیال نہیں کیا گیا ہے۔

پس جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ اس ٹیڑھے، راستہ کو سیدھا کرے اور لوگوں کے لئے ایک ایسی جماعت (امتِ اسلامیہ) پیدا کرے جو ان کو اچھے کام کا حکم کرے اور بُرے کام سے روکے اور ان کے بگڑے ہوئے رسم و رواج کو بدلے تب یہ بات اس پر موقوف ہوئی کہ قیصر و کسریٰ کی حکومت برباد کی جائے۔ اور ان کی پیدا کی ہوئی بُری عادتوں کو درست کیا جائے کیونکہ

ان کی پیدا کردہ حالت نے معتدل مزاج ملکوں میں گہرا اثر کیا تھا۔اس لئے ان دونوں بادشاہوں کے برباد ہونے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ ہوا اور رسول اللہ ﷺ نے خبر دی کہ کسریٰ برباد ہوگا اور اس کے بعد کوئی بھی کسریٰ پیدا نہ ہوگا اور قیصر برباد ہوگا اس کے بعد کوئی دوسرا قیصر پیدا نہ ہوگا۔ اور تمام دنیا کے باطل کو مٹانے والا (قرآن کریم) اللہ کی طرف سے نازل ہوا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عرب کے باطل کو رسول اللہ ﷺ اور اس کے صحابہ کے ہاتھوں سے مٹائے گا۔اور عرب کے ہاتھوں سے قیصر اور کسریٰ کے بال کو مٹائے گا اور باقی ملکوں کے باطل کو ان دونوں بادشاہوں کے رہنے والوں کے ہاتھوں سے مٹائے گا۔

مہاجرین اولین اور انصار سب بنے قریش اور قریش کے ارد گرد رہنے والوں کے اسلام میں داخل ہونے کا پھر ان کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ نے عراق اور شام فتح کرایا۔اس کے بعد عراق اور شام والوں کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ نے فارس اور روم فتح کرایا۔ پھر ان پر اللہ تعالیٰ نے ہندوستان وترکستان اور سوڈان فتح کرایا۔گویا کہ یہ کام ایک مکان کی طرح ہے جو دیواروں پر کھڑا ہوتا ہے اور دیواریں بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا چھ فوائد سے رسولوں کے بھیجنے کی حکمت بھی سمجھ میں آ گئی اور یہ بات بھی کہ رسول اللہ ﷺ کے آنے سے جو نتیجہ ظاہر ہوا وہ قرآن پر عمل کرنے سے ہوا۔پس اس تمام نتیجہ کو قرآن کی تعلیم کا نتیجہ سمجھنا چاہئے اور اس نتیجہ کے پیدا کرنے کے لئے قرآن کو نازل کیا گیا ہے (یہ چھ فوائد امام ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے لئے گئے)۔

فوائد متفرقہ

۱۔ رسول اللہ ﷺ کی شریعت کا اصل مول متہ کیا تھا؟

رسول اللہ ﷺ نے یہ دعویٰ کیا کہ آپ خود ابراہیمی ملت کو ان کے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام کے طریقہ پر زندہ کرنا چاہتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام گزر چکے تھے اور وہ بھی ابراہیمی ملت کو زندہ کرنا چاہتے تھے لیکن اسرائیل (یعقوب) بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر۔اس لئے رسول اللہ ﷺ کی نظر ہمیشہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر پڑتی ہے جیسا کہ قرآن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے

إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝ (سورہ مزمل ۱۵)

(یعنی بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک گواہی دینے والا رسول بھیجا ہے جیسا کہ ہم نے فرعون کی

ویب : www.hikmatequran.org ای میل : hikmatequran@gmail.com

طرف ایک رسول بھیجا) اس آیت میں مذکورہ بالا بات کی طرف اشارہ کیا ہوا ہے۔

تمام شریعتوں کا اصل حظیرۃ القدس (اس جہان کا انتظام کرنے والی مقدس مجلس) میں موجود ہے۔پس جن بزرگوں کا تعلق حظیرۃ القدس سے ہے وہ ہر شریعت کو وہاں سے معلوم کر سکتے ہیں رسول اللہ ﷺ بھی موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو وہاں سے معلوم کرتے تھے۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے دنیا کی اقوام تک دین حنیفی کی کیسے تبلیغ فرمائی؟

رسول اللہ ﷺ نے عرب کے سوا تمام دنیا کو اس طرح دعوت دی اور ارشاد فرمایا کہ توراۃ اور قرآن کی تعلیم ایک ہی ہے اگر تم کو ان دونوں کتابوں میں سے کسی کتاب کی تعلیم پر اعتراض ہے تو تم ان دونوں کتابوں جیسی تعلیم پیش کرو۔اگر تمہاری تعلیم توراۃ اور قرآن کی تعلیم سے زیادہ رہنما ثابت ہوئی تو میں اس کی تابعداری کروں گا۔

لیکن خاص عرب قوم کو صرف اکیلے قرآن کی تعلیم کی دعوت دیتے تھے۔قرآن اور توراۃ کی تعلیم کے بارے میں قرآن نے جو اعلان کر رکھا ہے اس کو سورۃ المائدہ کی آیات ۴۴ سے ۵۰ تک دیکھنا چاہیے۔

۳۔ دینِ حنیفی کی دوسرے ادیان سے برتری

اس وقت مسلمانوں کے سوا زمین پر جتنی بھی جماعتیں موجود ہیں ان میں سے ایک حنفی (یعنی یہودی اور عیسائی) ہیں جن کے پاس تورات ہے دوسرے صابی ہیں پھر صابی مذہب والوں کے کئی اقسام ہیں (۱) ایران کے مجوسی، جن کے پاس زردشت کی کتاب ہے (۲) ہندو۔

ہندو دھرم والوں کی پھر دو جماعتیں ہیں، (۱) برہمن، جن کے پاس وید ہیں (۲) سمنی، جن کے پاس بُدھ کی نصیحتیں اور احکام ہیں۔ برہمنوں کی مثال ہمارے پاس یہودیوں جیسی ہے اور بُدھ دھرم والوں کی مثال عیسائیوں کی طرح ہے۔

حنیفی اور صابی مذہب والوں کے سوا تیسرے وہ لوگ ہیں جو عقل اور فکر سے سوچی ہوئی باتوں پر چلتے ہیں جن کے مرکز یونان اور روم ہیں۔انہوں نے جب کبھی کوئی بادشاہی قائم کر کے قوم کو اکٹھا کیا ہے اواس لئے ان کو دنیا کے قوانین سے کسی اونچے قانون کی ضرورت پڑی ہے تو انہوں نے اہلِ کتاب کے قانون میں سے جو قانون ان کی رائے کے مناسب ہوا ہے اس کو لیا ہے اور اس کے بعد یا تو کسی (ڈکٹیٹر) بادشاہ کی طاقت سے مدد لی ہے یا آسمانی ادیان میں سے کسی دین کی طرف انہوں نے رجوع کیا اس طرح انہوں نے اپنی عقل سے کام لیا ہے۔

زردشت ایرانیوں کی کتاب اور وید بدھ دھرم والوں کی کتاب یہ سب کتابیں توراۃ کے درجہ کو کبھی نہیں پہنچ سکتیں۔ اس بات کو مذکورہ بالا مذاہب والے بھی مانتے ہیں۔

حاصل مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا جماعتوں میں سے کسی جماعت کے پاس بھی تورات جیسی کتاب نہیں ہے جس میں انبیاء سے لیا ہوا قانون اکٹھا کیا ہوا ہو۔

۴۔ابراھیم علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے امام کا خطاب کیوں ملا؟

ابراہیم علیہ السلام کا دین کسی زمین یا کسی قوم کے ساتھ خاص نہ تھا بلکہ روئے زمین کے ہر نوع انسانی کے لئے تھا۔ ابراہیم علیہ السلام کے بعد کوئی بھی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا جس نے ابراہیم علیہ السلام کی طرح تمام نوع انسانی کے فائدہ کے لئے کوئی عام فکر پیش کیا ہو۔ یہ معنیٰ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ہیں اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (یعنی اے ابراہیمؑ! میں تجھ کو لوگوں کے لئے امام بنانے والا ہوں)۔

۵۔ حنیفی مِلّت کی اصلی روح

ابراہیم علیہ السلام کے دین کی اصل روح یہ تھی کہ کسی شخص کی کسی بھی جماعت پر بادشاہی نہ ہو اور کوئی چیز بھی مخلوقات میں سے خدا نہیں بن سکتی۔ اس عقیدہ کو ہی توحید کہا جاتا ہے۔ یہ ایسا فکر ہے کہ جس کو ہر ایسا شخص پسند کرے گا جس کی انسانیت اور عقل سلامت ہوں گے کیونکہ کوئی بھی انسان نہیں چاہتا کہ اپنے جیسے انسان سے دھوکا کھا جاوے اور اس کا زیردست ہو کر رہے بلکہ ہر ایک انسان ایسی بات کو پسند کرتا ہے جس میں مشورہ لیا گیا ہو اور اس مشورہ میں اس کو بھی دخل ہو۔ یہ گویا کہ انسانی فطرت ہے۔

اس کے سوا بڑے سمجھدار لوگوں کے پاس یہ بھی ثابت ہے کہ اس جسمانی جہان کے پردہ کے پیچھے اور دوسری ذات بھی ہے جس کے لازمی صفات کی بنا پر یہ جہان پیدا ہوا ہے وہ ذات انسانی حواس کے سمجھنے سے بالکل دور ہے۔ اس لئے ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز کو اپنے حواس سے معلوم کر سکے۔ اس کو اللہ کا درجہ نہ دے کیونکہ اللہ کی ذات حواس کے سمجھ سے بالکل باہر ہے۔

پس جو بھی انسان آنکھوں اور دوسرے حواس سے معلوم کی ہوئی مخلوق کو اللہ کر کے نہ سمجھے گا تو وہ اللہ کے خاص بندوں میں سے ہے۔

٦۔ یھودی اور عیسائی اگرچہ حنیفی ملت کی شاخیں ھیں لیکن انھوں نے اس کو پوری تبلیغ نھیں کی۔

پانچویں فائدے میں بیان تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعوت تمام روئے زمین کے انسانوں

کے لئے تھی لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ دعوت آپ کی زندگی میں انسانیت کے تمام اقسام تک نہ پہنچ سکی۔ پس آپ نے دعا مانگی کہ کاش: اللہ تعالیٰ اس کو اولاد دے جن کے لئے ایک مرکز قائم کرے! اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد کی طرف سے آپ کے فکر (یعنی دعوت توحید) کو انسانوں کے تمام اقسام تک پہنچایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا قبول کی اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ دو فرزند عطا فرمائے۔ ان کے لئے آپ نے دو تبلیغی مرکز قائم کئے۔ اسحٰقؑ کے لئے بیت المقدس کی مسجد اور اسمٰعیلؑ کے لئے مکہ شریف کی مسجد الحرام۔

پھر جو بھی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے بلند خیال والا پیدا ہوا ہے اس نے کوشش کی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے فکر کو انسانوں کے تمام اقسام تک پہنچا دے۔ اور خود قوموں کا امام (پیشوا) بنے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی ان بلند خیال والے انسانوں میں سے ایک بڑے پیغمبر تھے انہوں نے یہ کوشش کی لیکن وہ بھی کام کو پورا نہ کر سکے کیونکہ ان کی قوم نے، جسے آپ نے ابراہیمی ملت کی اشاعت کیلئے اپنا مددگار بنایا تھا، اس کی پوری تابعداری نہ کی۔ اس لئے کام ادھورا رہ گیا۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کی یہ مرضی تھی کہ اپنی قوم کو مصر کے ملک سے نکال کر بیت المقدس میں بسائیں اور وہاں اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے ایک ادارہ قائم کریں لیکن آپ بیت المقدس تک پہنچے ہی نہیں کہ راستے میں فوت ہو گئے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام جیسا بلند ہمت دوسرا کوئی بھی پیدا نہیں ہوا جو ان کے چھوڑے ہوئے کام کو پورا کر سکے۔

موسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسیٰ علیہ السلام آئے اور انہوں نے ارادہ کیا کہ خود موسیٰ علیہ السلام کا قائم مقام بن کر ابراہیمی دعوت کو انسانوں کے تمام اقسام تک پہنچا دے! لیکن یہود نے اس بات کو قبول نہیں کیا۔

اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام نے فقط ایک ''تبلیغی جماعت'' تیار کی جو ابراہیمی دعوت کو تمام اقوام تک پہنچاتی رہے جیسے ہمارے اساتذہ، امام شاہ ولی اللہؒ کے اتباع (پیرو) انگریزی حکومت کے زمانہ میں فقط دین کی تبلیغ کرتے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی تیار کردہ تبلیغی جماعت کی کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ مشرقی رومی سلطنت نے، جو اسرائیلی قوم سے الگ دوسری نئی قوم نے عیسائی مذہب قبول کیا اور اس نے وہ کام کر دکھایا جس کی یہود کو توفیق نہ ہوئی۔

یہودیوں نے بھی ابراہیمی طریقہ پر ایک ادارہ قائم کیا لیکن وہ محض اپنی قوم کے لئے تھا دوسرے انسانوں سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی ان کا مقصد فقط یہ تھا کہ وہ خود ابراہیم علیہ السلام کے دین پر چلیں گے اور جو شخص ابراہیم علیہ السلام کے دین کی دوسری اقوام میں تبلیغ کرتا اسے دشمن

سمجھتے اوراس کوطرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے۔

عیسیٰ علیہ السلام نے پہلے یہود کوابراہیمی ملت کی روح سمجھائی لیکن جب ان سے نااُمید ہوگئے تو اپنے حواریوں کی ایک جماعت تیار کی اوران سے یہ عہد لیا کہ وہ ابراہیمؑ ملت کی روح کو تمام اقوام میں پھیلا دیں گے۔

اب ابراہیمی ملت پر چلنے والوں کے دو مذہب قائم ہوگئے۔ (۱) یہودی جنہوں نے ابراہیمی دعوت کو بنی اسرائیل کے ساتھ ہی مخصوص کردیا (۲) عیسائی جنہوں نے ابراہیمی دعوت کو دوسری اقوام تک بھی پہنچایا لیکن سالہا سال کے بعد عیسائیوں نے بھی ابراہیمی ملت کی روح کو تو چھوڑ دیا، بلکہ اس کی صورت کو بھی بگاڑ دیا۔

۷۔ حنیفی ملّت کی پوری پوری تبلیغ کون کرے گا؟

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ان کی اولاد میں سے ایک نبی ﷺ پیدا ہوگا جو ان کی تعلیمات کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلائے گا۔ابراہیم علیہ السلام کواس وعدہ پر پورا بھروسہ تھا اور یہ بھی یقین تھا کہ وہ نبی اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے پیدا ہوگا۔اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کے حکم سے ایسی زمین میں بسایا جہاں کوئی کھیتی نہیں ہوتی کیونکہ کھیتی کرنے والے لوگوں کو ہمیشہ اپنے سرسبز وطن پر فخر کرتا رہتا ہے اور وہ اپنے وطن والوں کو جدا قوم سمجھتے ہیں اس کے بعد اگر وہ اس وطن والے کسی خاص آدمی کی اولاد ہوں گے تو وہ اپنی نسل پر بھی اترائیں گے اور دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھیں گے اوران میں اپنے خیالات کی تبلیغ کرنے سے رُک جائیں گے۔کھیتی والے ملکوں کے باشندوں کو دیکھا گیا ہے کہ ان کے باپ دادا کی اولاد اگر دوسرے ملک میں بستی ہے اوران کے ساتھ کسی بات پر جھگڑا ہوجائے تو وہ اپنے بھائیوں کے فائدہ کو اپنے وطن کے مفاد پر کبھی ترجیح نہیں دیں گے۔

اسی طرح اگر ایک جماعت کی بنیاد چند سچے اعتقادات پر قائم ہو اوراس جماعت کا ایک حصہ جدا ہوکر کسی بڑے خوشحال ملک میں آباد ہوجائے تو وہ حصہ اپنے مذہب والوں کی مصلحت کا اس وقت کبھی خیال نہیں کرے گا، جب ان کے مذہب کی مصلحت ان کے وطن کی مصلحت سے مخالف ہوگی۔ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے اسماعیل کو ایک بیابان میں بسانے سے یہی مقصد تھا کہ اس کی اولاد میں وطن کی محبت پیدا نہ ہو بلکہ اپنے مذہب کو ہر حالت میں مقدم رکھتے آئیں۔

یہ بھی آپ کو معلوم تھا کہ جس بیٹے کا اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ وعدہ کیا تھا جو اسماعیل کی اولاد میں سے ہوگا۔وہی ان کی ملت کو تمام دنیا میں پھیلانے میں کامیاب ہوگا۔اسی لئے اسماعیلؑ

کو حجاز کے بیابان میں رہنے کا حکم دیا۔اس کے علاوہ ابراہیم علیہ السلام یہ بھی جانتے تھے کہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے سوا بہت سے لوگ اس مقصد کے لئے کوشش کریں گے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوں گے کیونکہ وہ خوشحال ملکوں کے باشندے بنیں گے۔پس ان میں کسی نہ کسی قسم کا تمدن آئے گا۔پھر دوسرے لوگ جن کا تمدن بھی انہی کی طرح ہوگا کبھی برداشت نہ کریں گے کہ ان کے تابعدار ہوکر رہیں اور وہ ان سے برتر و بلند رہیں۔اسی وجہ سے ہی موسیٰ علیہ السلام اپنے مقصد تک پہنچ نہ سکے۔

۸۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کہ حنیفی دین کی پوری تبلیغ رسول اللہ ﷺ کریں گے۔

عیسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ یہودی، ابراہیمی ملت کو تمام اقوام میں پھیلا دینے کی کوئی کوشش نہیں کرتے تو ان سے نااُمید ہوگئے لیکن پہلی کتابوں سے ان کو معلوم تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے جو مردِ خدا اس کے دین کو تمام اقوام میں عام کرے گا وہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے پیدا ہوگا۔اس لئے انہوں نے ایک پیغمبر کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی اور فرمایا کہ جس کام کے کرنے کا میں نے ارادہ کیا تھا اس کو وہ آکر پورا کرے گا۔اوراپنے حواریوں کو بھی وصیت فرمائی کہ جب اس کا ظہور ہو تو تم اس کی تابعداری کرنا۔لیکن عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کی مخالفت کے پیش نظر اس بات کو صاف اور واضح الفاظ میں بیان نہیں فرمایا بلکہ مختلف اوقات میں علیحدہ علیحدہ موقعوں پر حسبِ ذیل طور پر ارشاد فرمایا:

۱۔ میں اپنے رب سے درخواست کروں گا کہ تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے کہ اب تک تمہارے ساتھ رہے (یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶) یعنی یہ میری قوم تمام اقوام انسانیت میں پھیل جائے۔

۲۔ میں تمہیں یتیم نہ چھوڑوں گا۔میں تمہارے پاس آؤں گا۔ یعنی میری تعلیم توحید کی تکمیل ہوگی (یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۸)

۳۔ میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں لیکن مددگار (یعنی روح القدس سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔ (یوحنا باب ۱۴ آیت ۲۵)

۴۔اب میں اپنے بھیجنے والے کے پاس جاتا ہوں اور تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا تو کہاں جاتا ہے، بلکہ اس لئے کہ میں نے یہ باتیں تم سے کہیں تمہارا دل غم سے بھر گیا لیکن میں تم سے سچ کہتا رہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ

مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصور وار ٹھہرائے گا مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم انکی برداشت نہیں رکھ سکتے، لیکن جب وہ (توحید) سچائی کا روح آئے گا تو تم کو پوری سچائی کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سُنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا کہ کامیابی تمہاری ہے۔

وہ میرا جلال ظاہر کرے گا اس لئے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا جو کچھ رب کا ہے وہ سب میرا ہے۔ اس لئے میں نے کہا کہ وہ مجھ ہی سے حاصل کرتا رہے گا اور تمہیں خبر دے گا۔ تھوڑی دیر تم مجھے نہ دیکھو گے اور پھر تھوڑی دیر میں تم مجھے دیکھ لو گے۔ (انجیل یوحنا باب ۱۶ آیت ۵)

عیسیٰ علیہ السلام کی ان تمام بشارتوں سے یہ بات ظاہر ہے کہ یہ تمام بشارتیں رسول اللہ ﷺ کے تشریف لانے کے متعلق ہیں۔ ان بشارتوں کے علاوہ انبیاء سابقین کی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کے آنے کے بارے میں بہت سی بشارتیں موجود ہیں۔ یہود ان بشارتوں کو دیکھ نہیں سکتے اس لئے انہوں نے ان پیشگوئیوں کو غلط معنیٰ بیان کر کے بگاڑ دیا ہے تا کہ لوگ ان کے صحیح معنیٰ سمجھ نہ سکیں لیکن وہ اللہ کی صحیح بات کو بدل نہیں سکتے۔ جو شخص بھی توراۃ اور اناجیل کو غور و فکر سے پڑھے گا وہ حق کو سمجھ جائے گا۔ اور جو کچھ ان سرکشوں نے لکھا ہے اسے چھوڑ دے گا۔

۹۔ رسول اللہ ﷺ کے نبی ہو کر آنے کا اصلی مقصد

ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے رسول اللہ ﷺ کے آنے کا یقین تھا اور عیسیٰ علیہ السلام نے بھی آپ کے آنے کی خوش خبری دی تھی اس لئے رسول اللہ ﷺ کے آنے کا مقصد متعین ہو جاتا ہے وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ دنیا میں ایک زبردست حکومت قائم کریں گے جس کا مقابلہ دوسری کوئی بھی حکومت نہیں کر سکے گی۔ اور اس حکومت میں تمام اقوام کو حنیفی ملّت پر جمع کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ اپنے اس مقصد میں یقیناً کامیاب ہوئے لیکن آپ کے اس مقصد کی تکمیل میں آپ کے خلفاء ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کی کوششوں کو بھی شریک اور شمار کیا جائے۔ ان چاروں بزرگوں نے اس مقصد کو یقیناً پورا کیا ان چار کے بعد پھر قدم پیچھے ہٹنے شروع ہوئے۔

۱۰۔ رسول اللہ ﷺ کا اپنے مقصد میں کامیاب ہونا

قرآن کریم رسول اللہ ﷺ کی کامیابی کی خوش خبری ایک مثال کے ذریعے سناتا ہے وہ یہ ہے:
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ (سورۂ فتح کی آخری آیت) اس مثال میں ابراہیم علیہ

السلام کی ملت کی روح دیکھنے میں آتی ہے دوسری طرف رسول اللہ ﷺ نے وہ کام کیا ہے جو دوسرے کسی بھی انسان نے نہیں کیا۔ قرآن اس تمام کام کو اکیلے رسول اللہ ﷺ کا کام نہیں ٹھہراتا بلکہ آپ کی ذاتِ مبارک کے ساتھ اس کام کو آپ کے اصحابؓ کا کام بھی ٹھہراتا ہے۔ اس لئے کسی کو بھی جائز نہیں ہے کہ آپ کی ذاتِ مبارک کو غیبی طاقت کا مالک مانیں اور قانون کا مالک (بادشاہ) ٹھہرائے۔ اور یہ فکر توراۃ، انجیل اور قرآن سے ثابت ہوتا ہے۔ اس فکر کے ساتھ مندرجہ ذیل باتیں بھی یاد رکھنی چاہئیں۔

(پہلی بات) وہ حکماء اور عقلمند جنکی سمجھ پر بھروسہ کیا جاتا ہے ان میں سے کسی نے بھی انسانی اجتماع کے لئے قرآن جیسا پروگرام پیش نہیں کیا۔ سورہ اسراء کی آیت ۸۸ کے معنی یہ ہیں:

(اے رسولؐ کہہ دو: اگر انسان اور جن اس پر جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا کوئی کتاب لے آئے تو اس جیسا نہیں لاسکیں گے اگرچہ بعض ان کے مددگار بھی بن جائیں)

(دوسری بات) صابی مذہب کی جو شاخیں ایران، چین اور ہندوستان میں ہیں ان سب کا مقصد وہی تھا جو رسول اللہ ﷺ اور قرآن نے پیش کیا اور ان مذاہب میں بہت بڑے درجہ والے آدمی بھی پیدا ہوئے لیکن انہوں نے بھی تمام انسانی جماعتوں کے لئے ابراہیم علیہ السلام کے دین جیسا مقصد پیش نہیں کیا۔ جو مذہبی کتابیں ہندوستانیوں، ایرانیوں، چینیوں اور یونانیوں کے پاس ہیں ان کی اللہ کے فضل سے ہم کو سمجھ ہے لیکن اس مقصد کو کیسے پورا کیا جائے اس میں وہ بھی قرآن سے بہت پیچھے ہیں۔

ان مذاہب کے بعض آدمیوں میں ایسے افکار اور خیالات موجود ہیں لیکن وہ بھی کوئی جماعت نہ بنا سکے۔ جماعت ایک آدمی سے نہیں بنتی بلکہ اس وقت وجود میں آتی ہے جب بہت سے آدمی ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں اور اس بات پر اتفاق کریں۔

(فائدہ) میرے استاذ مولانا عبیداللہ سندھی فرماتے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ میں امام ولی اللہ اور آپ کے اتباع سے پہلے کوئی بھی ایسی جماعت نہیں ملتی جس نے ایسی تحریک پیدا کی ہو جو مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کو اکٹھا کر سکے! شاہ صاحب کا فلسفہ جس طرح مسلمانوں میں اپنا اثر ظاہر کرتا ہے اسی طرح ہندوؤں پر اثر کر سکتا ہے۔ کیونکہ امام صاحب کے فلسفہ کی بنیاد ہندوؤں کے فلسفہ کے موافق ہے اس لئے ہم ولی اللہ کی امامت ہندوؤں سے بھی منوا سکتے ہیں (یعنی ہندوؤں سے بھی اس نام کی حقانیت قبول کرا سکتے۔ ہندوستان کی قومیں مجتمع ہو گئیں تو پھر پوری دنیا کی اقوام اکٹھی ہو جائیں گی۔

(تیسری بات) رسول اللہ ﷺ اگرچہ عام انسانیت کے رہبر اور انکو پاک کرنے والے تھے لیکن آپ کی پہلی توجہ اور فکر اپنی قومِ قریش کو کمال تک پہنچانے کی تھی کیونکہ:

۱۔ عام عرب بیت اللہ شریف کی عزت کرتے تھے۔ پس بیت اللہ شریف اور ابراہیم علیہ السلام کی وجہ سے وہ قریش کو اپنا دینی سردار سمجھتے تھے۔ بنی اسرائیل کو عرب اگرچہ عزت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے علم و فضیلت کے قائل بھی تھے اور ان کو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد بھی سمجھتے تھے لیکن چونکہ ان کا تعلق بیت اللہ شریف سے کچھ نہیں تھا اس لئے ان کو اپنا دینی رہبر نہیں سمجھتے تھے۔

ابراہیم علیہ السلام اصل میں عراق عجم سے تھے تو اس کی اولاد اسمٰعیل اور اسرائیل سب عجمی النسل ہوتے۔ اور جبکہ سارہ لفظ بمعنیٰ حمیدہ خالص سندھی ہے تو سندھ سے تعلق زیادہ قوی ہے۔ قریش اور یہود کے اخلاق سندھ میں اب تک موجود ہیں۔

۲۔ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد خالص عربوں میں رہ کر عرب بن گئی۔ اس عرب قریش کو اپنا سمجھتے تھے لیکن بنی اسرائیل کو اپنا نہیں سمجھتے تھے۔

۳۔ قریش تجارت کرتے تھے۔ تجارت پیشہ طبقہ انسانیت کا درمیانہ درجہ ہے اس لئے ان کو جس طرح عوام سے واسطہ پڑتا تھا اسی طرح بادشاہوں سے بھی تعلق تھا وہ بادشاہوں اور انکے حالات کو سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرتے تھے کہ وہ ان سے خوش ہوجائیں اور اپنے بیوپار کو ترقی دینے کے لئے عام لوگوں کو بھی اپنی طرف کھینچنا جانتے تھے یہ بات عام عربوں میں نہ تھی وہ بدو اور اجڈ تھے۔

۴۔ قریش رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے سے تقریباً ایک سو برس پہلے اکٹھے ہوکر مکہ شریف میں بیت اللہ شریف کے اردگرد آکر رہنے لگے تھے ان کو رسول اللہ ﷺ کے دادا قُصی نے کوشش کر کے اکٹھا کیا تھا۔ اس لئے بھی عام عرب ان کی عزت کرتے تھے ان سو برس سے پہلے وہ عرب کے مختلف قبائل میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور وہ قبائل قریش کی ایسی عزت کرتے تھے جس طرح آج کل پیروں اور بزرگوں کی اولاد کی ہوتی ہے۔ پس اگر قریش رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و تبلیغ سے راہِ راست پر آجائیں گے اور عام لوگوں کے فائدہ کے لئے کام کرنا چاہیں گے تو عوام آسانی سے ان کی تابعداری قبول کریں گے!

۵۔ عرب کے شمال میں مختلف یہودی قبائل بستے تھے جو بیوپار کرتے تھے، حجاز کے اقتصادی حالات کا دارومدار اکثر انہی پر تھا۔ پس جیسا کہ قریش اور یہودی دونوں تجارت پیشہ تھے اس

لئے یہودی ایک تو بیوپار کی وجہ سے دوسرا اس وجہ سے کہ دونوں قومیں ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھیں قریش سے دوستی اور میل ملاپ کی رسمیں جاری رکھتے تھے۔

قریش کی یہ پانچ حالتیں رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے سے پہلے تھیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے جب اپنی شروع عمر میں اپنے مبعوث ہونے سے پہلے قریش کے بڑوں سے سُنا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی اولاد میں سے ایک ایسا رسول پیدا کرے گا جو اس کی ملت کو دنیا میں شائع کرے گا تب آپ نے ابراہیمی ملت کو زندہ کرنے اور قریش کو بلندی کے درجہ تک پہنچانے کا خیال کیا کیونکہ یہ کام کرنے کا آپ کی فطرت و طبیعت خواہش کرتی تھی اور اس کام کے صحیح ہونے کی شہادت ایک تو آپ کا دل دیتا تھا دوسری وہ روایت تھی جو ابراہیم علیہ السلام سے نقل ہوتی ہوئی پہنچی تھی۔ اسی دُھن اور سوچ بچار میں خارج کا تخلیہ بھی کرنا آتا ہے۔

نبوت حاصل ہونے کے بعد یہ کام آپ پر آسان ہوگیا کیونکہ وحی کے ذریعہ سے اس کام کے صحیح ہونے کا آپ کو زیادہ یقین ہوگیا۔ نبوت سے پہلے اور بعد کے حالات میں فرق صرف یہ تھا کہ نبوت سے پہلے آپ نہ نبوت کو جانتے تھے اور نہ اس درجہ کے ملنے کی آپ کو اُمید تھی۔ آپ صرف ابراہیمی ملت کے زندہ کرنے سے قریش کو بلند درجہ پر پہنچانا چاہتے تھے۔ نبوت کے بعد آپ کا پروگرام (دستور العمل) یہ تھا کہ آپ قریش اور قریش کے اردگرد بسنے والے قبائل کی اصلاح میں مصروف ہوں گے پھر جب اس کام سے فارغ ہوں گے اور آپ کی قوم میں آپ کی طاقت بڑھے گی تو دوسری اقوام بنی آدم کی درجہ بدرجہ اصلاح کریں گے یہاں تک کہ تمام دنیا کی اصلاح کو کمال تک پہنچائیں گے۔

۱۱۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا خلاصه

امام شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی قدس اللہ سرہ کی تعلیم کے بموجب انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایت (جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو لوگوں کو پاک کرنے کے لئے بھیجا ہے) کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں میں چار خصلتیں پیدا ہوں۔

۱۔ طہارت، طہارت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت سے کچھ چیزوں کو ناپاک ٹھہراتا اور اپنے بدن کو ان پلید چیزوں سے بچاتا ہے جیسے پیشاب، پاخانہ وغیرہ۔ پھر چونکہ یہ بات اس کے دل میں رکھی گئی ہے اور اسی سے ایک گھڑی بھی غافل نہیں رہ سکتا اس لئے اس خصلت کو کمال تک پہنچانا اس کے لئے آسان ہے پھر وہ ہر کلام، ہر فکر اور ہر عادت، جسے وہ پیشاب اور پاخانہ کی طرح بُرا سمجھے گا، اس سے بھی اپنے آپ کو بچائے گا! امام شاہ صاحب کے

نزدیک یہ خصلت دین کا چوتھا حصہ ہے۔

۲۔ اخبات: تواضع و نوڑت کرنا۔ اس خصلت کی یہ حقیقت ہے کہ انسان جب اپنے باپ دادوں یا مرشدوں یا استادوں یا نیک بخت حاکموں اور بادشاہوں میں سے کسی کی عزت کرتا ہے تو جب کسی وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوگا تو اپنے دل میں اس وقت ایک قسم کی عاجزی محسوس کرے گا۔ اور یہ خواہش کرے گا کہ کاش! وہ اس کو کسی کام کے کرنے کا حکم دے اور یہ اس کام کو خوشی سے پورا کرکے اپنی تابعداری کے ذریعے اس کے نزدیک ہوجائے۔ اس آدمی کو اس بزرگ کے نزدیک ہونے میں ایک قسم کی لذت محسوس ہوگی۔ یہ انسان کی فطرت ہے کوئی آدمی اس کو سکھائے یا نہ سکھائے لیکن یہ بات اس کے دل میں رکھی ہوئی ہے۔

اس کے بعد جب وہ اپنے دل کی ہدایت سے یا کسی نیک بخت کے ہدایت کرنے سے اللہ پر ایمان لائے گا اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی کرنے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہونے کی خواہش اس درجہ کو پہنچے گی جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے کسی کو بھی شریک نہیں کرے گا۔ تب کہا جائے گا کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی کرنے کی خصلت حاصل ہوگئی ہے اس وقت اگر وہ کسی کے آگے عاجزی کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے کرے گا جس کے آگے عاجزی کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی نہیں دیکھے گا اس کے آگے عاجزی کبھی بھی نہیں کرے گا۔ اس کا باپ بھی اگر اس کو کوئی حکم دیگا تو وہ سمجھے گا کہ باپ کی تابعداری کرنے سے میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہوجاؤں گا۔

۳۔ سماحت (سخاوت) اس خصلت کی حقیقت یہ ہے انسان بہت سی چیزوں کو پسند کرتا ہے، اس کا دل چاہتا ہے کہ اچھا کھانا کھائے۔ اچھے کپڑے پہنے اچھے مکان میں رہے اس کی خوبصورت عورت ہو اور قوم میں عزت والا ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اس کو قرب حاصل ہو۔ پھر اگر کسی انسان کی طبیعت ایسی ہوجائے کہ اچھا کھانا کھائے اور عورتوں سے صحبت کرکے ان لذتوں کو یاد کرتا ہے تو یہ طبیعت اس کو دوسری ضروریات میں مشغول ہونے اور پورے کرنے سے روکتی رہے گی۔

لیکن اگر اس کی طبیعت ایسی ہوگی کہ کھانا کھانے اور عورتوں کے نزدیک ہونے کے مزہ حاصل کرنے کے بعد جب فارغ ہو تو اس کو بھلادے اور اس کی طرف کوئی خیال نہ کرے تو یہ انسان اپنے دوسرے کام بھی پورے کرسکے گا۔ اور اپنے اخلاق کو بھی کمال تک پہنچا سکے گا یہ شخص اگر کتاب اٹھا کر پڑھے گا یا مسجد میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرے گا تو وہ اپنے دماغ کو دنیا کے تمام

ویب : www.hikmatequran.org ای میل : hikmatequran@gmail.com

افکار سے پاک کرکے پھر یہ کام کرے گا اس شخص کی طبیعت کی مثال پانی کی طرح ہوگی۔ پانی میں اگر انگلی داخل کرو تو اس میں انگلی چلی جاتی ہے اور جب باہر نکالو تو پانی میں کسی قسم کا بھی سوراخ دکھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح یہ انسان جب نفسانی کام کرے گا تو اس کو اچھی طرح سے کرے گا اور جب اس سے فارغ ہوگا تو اسکو بھلادے گا۔ اسی عادت کو ہم سخاوت کہتے ہیں۔

۴۔ عدالت۔ اس خصلت کی انسانی جماعت کو کس قدر ضرورت ہے اس کو ہر ایک جانتا ہے۔ کوئی بھی اجتماع عدالت کے بغیر قائم نہیں ہوتا۔ پس عدالت یا تو انسانیت کے برابر ہے یا ایک دوسرے کو لازم وملزوم ہیں۔ جس انسان، گھر قبیلہ یا قوم میں انصاف نہ ہوگا اس میں کسی قسم کی بھی انسانیت نہ ہوگی۔

حضرت امام شاہ صاحب ان چار خصلتوں کو تمام احکام کا اصل ان چار خصلتوں کے مخالف جو خصلتیں ہیں انہیں ان بُرے کاموں میں شمار کرتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں روکا ہے۔

ان چار خصلتوں کے علاوہ ایک اور چیز ہے جسے امام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس اللہ سرہ شعائر اللہ (یعنی اللہ کو پہچاننے کی نشانیاں) کہتے ہیں، حضرت امام ولی اللہ صاحب شعائر اللہ کی عزت کرنے کو اللہ تعالیٰ کی ذات کی عزت کے برابر رکھتے ہیں۔ پس جس الٰہی دین کو رسول اللہ ﷺ لائے ہیں اس کا خلاصہ امام شاہ صاحب کے پاس یہ ہے کہ انسان اپنے اندر مذکورہ بالا چار خصلتوں کے مخالف خصلتوں کو چھوڑنے کی کوشش کرے اور شعائر اللہ کی عزت کرے۔

۱۲۔ شعائر اللہ کی حقیقت

شعائر اللہ کی عزت کیسے کی جائے؟ اس کے لئے خدا شناس عارف اور حکماء اس بات پر متفق ہیں کہ اس جہان کے پیدا کرنے والے اور اس میں پھیر گھیر کرنے والے کی حقیقت تک انسانوں کی سمجھ پہنچ نہیں سکتی۔ کچھ خاص طریقے ہیں جن سے لوگ اللہ کے وجود کو سمجھ سکتے ہیں۔

ایک طریقہ جسے تمام انبیاء علیہم السلام پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جیسے سورج کی تجلی (عکس) آئینہ پر پڑتی ہے اور سورج آئینہ کے اندر دیکھنے میں آتا ہے پس اگر وہ آئینہ بھی سورج کے عکس جتنا ہوگا (نہ اُس سے بڑا اور نہ چھوٹا) تو لوگ حقیقی سورج میں اور سورج کے اس عکس میں اپنی گزشتہ معلومات ملانے کے بغیر فرق معلوم نہیں کرسکیں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تجلی اس کی مخلوق میں سے بعض چیزوں پر پڑتی ہے اور وہ چیزیں نرالی دیکھنے میں آتی ہیں پس اگر انسان ان چیزوں کی طرف دیکھنے کے وقت یہ سمجھے گا کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں اور ان چیزوں کی طرف کچھ بھی خیال نہیں کرے گا تو سمجھنا چاہئے کہ اس نے اللہ کی تجلی کو دیکھا اور وہ تجلی اس کو اس لئے دکھائی

گئی ہے کہ اس کو اللہ کی صفات میں سے کوئی صفت معلوم ہو جائے۔ انسان کو جب بھی سمجھ میں آجائے کہ یہ اللہ کی تجلی ہے تو اس پر لازم ہوگا کہ وہ اس تجلی کے آگے اپنی انتہائی طاقت سے جھکے اور اس کی تعظیم کرے اس تجلّی کی عزت اللہ تعالیٰ کی عزت کے قائم مقام ہوگی۔ کیونکہ جن چیزوں پر وہ تجلی پڑی انکی طرف کوئی بھی خیال نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کو اس تجلی کے دیکھنے کے وقت اس شیشے جیسا سمجھا گیا ہے جس پر صورت کا عکس پڑتا ہے یا ان چیزوں کو عینک کی طرح سمجھا گیا ہے جس سے انسان دور کی چیز کو دیکھ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک تجلی عرشِ عظیم پر پڑتی ہے۔ اس تجلی کو رحمٰن کہا جاتا ہے یہ وہ آخری تجلی ہے جس تک انسان کی سمجھ اپنے کی پہنچانے میں ترقی کر کے پہنچتی ہے اس کے بعد جو تجلی عرش عظیم پر پڑتی ہے اس سے نیچے اس تجلی کی پھلیبی ہی تجلیاں آسمان اور زمین میں ہیں۔

اگر انسان ان چیزوں کو دیکھتے وقت یہ سمجھے کہ میں اللہ کی تجلی کو دیکھ رہا ہوں اور ان چیزوں کی طرف بھی خیال کرے تو اس وقت ان چیزوں کو شعائر اللہ کہا جائے گا۔

شعائر اللہ کی تعظیم ایمان کے اجزاء میں سے ایک بڑا جزو ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں ایک ایسی طاقت رکھی ہے جس کی وجہ سے اس کو بلا واسطہ اللہ کے معلوم کرنے میں مزہ آتا ہے اور انسان اپنے تمام مقاصد میں سے اس مقصد کو بڑا مقصد کہتا ہے اور شعائر اللہ کی تعظیم بلا واسطہ اللہ تک پہنچاتی ہے۔ پس جس کے دل میں شعائر اللہ کی تعظیم ہوگی اس کے دل میں ایمان کے تمام اجزاء میں سے بڑا اجزء موجود ہوگا۔

مذکورہ بالا چار خصلتوں کو حاصل کرنے اور شعائر اللہ کی تعظیم کرنے سے ان ملائکہ جیسا ہو جاتا ہے جو اللہ کی تجلی کے آگے حاضر رہتے ہیں۔

امام ولیؒ اللہ ان چار خصلتوں اور شعائر اللہ کی تعظیم کو دو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہیں؛

(۱) **التطلع الی الجبروت** (یعنی اللہ تعالیٰ کا ان صفات کی طرف دیکھنا جن کا تعلق اس جہان کے نظام سے ہے۔)

۲۔ **التشبہ بالملکوت** (یعنی ان ملائکہ جیسا ہونا جو اللہ تعالیٰ کی تجلی کے آگے رہتے ہیں۔)

امام ولی اللہ دہلوی کے نزدیک **التطلع الی الجبروت** اور **التشبہ بالملکوت** دونوں وصفوں کا اپنے میں پیدا کرنا انسان کا انتہائی کمال ہے۔ انسان کی پیدائش میں اس کی فطرت کے موافق جو مخفی لطائف اور پاک طاقتیں رکھی ہوئی ہیں ان کی وجہ سے یہ دونوں صفتیں اپنے میں پیدا کرنا اس غرض سے لازم ہے۔

۱۳۔ عدالت کی وضاحت

یہاں کچھ باتیں جاننا ضروری ہیں اس کے بعد عدالت کی حقیقت اور ضرورت وضاحت سے سمجھ میں آجائیں گی۔

پہلی بات انسان کی حقیقت کیا ھے؟

حکماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ یعنی وہ بڑھنے والا۔ حس رکھنے والا اور ارادہ سے حرکت کرنے اور فکر کرنے والا جسم ہے۔ فکر کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ اپنے افکار کو ترتیب دے سکتا ہے انکے بہت سے اقسام بنا سکتا ہے اور ان کو اپنے فصیح کلام سے دوسروں کے آگے ظاہر بھی کر سکتا ہے۔

انسان کی اس تعریف کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے کہ انسان میں **التطلع الی الجبروت** اور **التشبہ الی الملکوت** کی دو طاقتیں رکھی ہوئی ہیں۔ اس لئے انسان کو یہ دونوں صفتیں اپنے میں پیدا کرنی چاہئیں۔

۱۔ وہ تمام حیوانات کی طرح اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے ایسی چیزوں کا محتاج ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے۔ ان چیزوں کے پیدا کرنے میں نہ تو انسان کی طاقت کام کر سکتی ہے نہ اس کی عقل اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ مثلاً: انسان پانی پیتا ہے میوہ کھاتا ہے پانی اور میوہ کو اللہ کی قدرت کے سوا دوسرے کسی نے بھی پیدا نہیں کیا۔

۲۔ دوسری بات انسان میں یہ رکھی گئی ہے کہ وہ کسی چیز کو پسند کرتا ہے لیکن اس تک نہ اس کے ہاتھ پہنچ سکتے ہیں نہ اس کی طبعی طاقت اس کو حاصل کر سکتی ہے پس وہ اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے کسی دوسری چیز کو اس چیز کے حاصل کرنے کا ذریعہ بناتا ہے مثلاً وہ درخت کی چوٹی پر میوہ دیکھتا ہے جس تک اس کے ہاتھ نہیں پہنچ سکتے۔ پس وہ میوہ کو حاصل کرنے کے لئے پتھر مارتا ہے تاکہ میوہ ٹوٹ کر نیچے گر پڑے یا درخت کی کسی ٹہنی کے ذریعے اس کو نیچے اُتار لیتا ہے یہ ہے اوزاروں کا استعمال۔ اس طرح جوں جوں اس کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں اوزاروں کے استعمال کا شوق بھی بڑھتا جاتا ہے اوزاروں کو حاصل کرنے اور تیار کرنے کے لئے انسان کوشش کرتا رہتا ہے کسی اوزار کے تیار کرنے میں اس کو تھوڑا وقت لگتا ہے اور کسی کی تیاری میں زیادہ تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اس لحاظ سے مالدار اس کو سمجھنا چاہئے جس کے پاس اوزار بہت ہوں اور غریب اس کو جس کے پاس اوزار نہ ہوں۔ غریب لوگ مالدار لوگوں کے اس لئے تابع ہوتے ہیں کہ مالداروں کے پاس اوزار ہوتے ہیں اور غریب لوگ

اپنی طبعی طاقت سے وہ کام نہیں کر سکتے جو اوزاروں کے ذریعے تھوڑے وقت اور کم طاقت سے ہو سکتے ہیں اس لئے وہ مالداروں کے پاس جاتے ہیں تا کہ ان کی طرف سے ان کی طبعی طاقت ہو اور مالداروں کی طرف سے اوزار، دونوں کو ملا کر کوئی کام کریں اور فائدے میں شریک ہوں۔ پھر اگر مالدار آدمی طاقتور بھی ہے تو وہ ترقی کر کے بادشاہ بن جائے گا۔ اور اگر اس کی طاقت دوسروں کی طاقت کے برابر ہے تو اس کو جماعت کا بڑا بنائیں گے۔

انسان اگر چہ بہت سے حیوانوں سے ضعیف ہے لیکن اس پر اللہ کی یہ مہربانی ہے کہ اس کو عقل دی ہے عقل حیوانی طاقت ہے جس پر اس کا ملکی فکر اثر کرتا ہے پس عقل سے انسان اوزار بناتا ہے اوزاروں کے واسطہ سے وہ اپنی ضعیف طاقت سے تھوڑے وقت میں وہ کام لے سکتا ہے جن سے بڑے سے بڑے جانور بھی عاجز ہیں اس کی عقل تمام حیوانی طاقتوں کی امام ہے۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اوزاروں کے استعمال کو اور ان کے واسطہ سے تھوڑی طاقت سے چیزوں کے حاصل کرنے کو ارتفاق کہتے ہیں۔

پھر ارتفاق کی کئی قسمیں ہیں

۱۔ وہ ارتفاق جس سے کوئی بھی انسان خواہ کہیں ہو، پھوٹ نہیں سکتا۔
۲۔ آداب المعاش (زندگی گذارنے کے طریقے)
۳۔ تدبیر المنزل (گھریلو زندگی کے طریقے)
۴۔ فن المعاملات (لوگوں کے آپس میں معاملات کے طریقے)
۵۔ سیاستہ المدنیہ (شہری نظم ونسق اور زندگی کے طریقے)
۶۔ سیاست (یعنی شہروں کو ملا کر ان کو کس طرح چلایا جائے)

پھر شہروں کو ملا کر چلانے کے کئی اقسام ہیں ان میں سے ایک قسم وہ ہے جس کو امام ولی اللہ الدہلوی قدس اللہ سرہٗ خلافت کہتے ہیں۔ جب تک ایسی زبردست خلافت جس کا مخالف جماعتیں مخالفت کرنے کے باوجود مقابلہ نہ کر سکیں جو قائم نہ ہو جائے کسی آدمی کے لئے بھی سستی کر کے بیٹھ رہنا جائز نہیں۔ یہ بات اُس وقت ممکن ہو سکتی ہے جب وہ اوزاروں کے استعمال میں درجۂ کمال کو پہنچ جائے۔

۱۴۔ رسول اللہ کی کوئی بھی تعلیم انسانی فطری صفات کے خلاف نہیں

امام ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ مذکورہ بالا ارتفاقات کو انسانی فطرت سے باہر کی چیز نہیں کہتے جو

انسان کے ساتھ چمٹا دی گئی ہو بلکہ فرماتے ہیں کہ انسانی فطرت ان تمام ارتفاقات کی خواہش کرتی ہے کیونکہ اگر کوئی انسان شہروں سے دور کسی جنگل یا بیابان میں پیدا ہو اور کسی سے بھی کوئی رسم و رواج نہ سیکھے تب بھی اس کو بھوک پیاس لگے گی، عورت کی خواہش ہوگی اور شادی کرنے کے بعد اس کے بال بچے پیدا ہوں گے جس کے بعد بہت سے گھر بن جائیں گے اور ان میں خرید و فروخت اور ان کے لین دین ہوں گے۔ اس طرح پہلا ارتفاق ترتیب وار موجود ہو جائے گا۔ پھر جب آبادی بڑھے گی۔ تو ضرور ان میں بلند اخلاق آدمی پیدا ہوں گے اور ان کے سامنے ایسے معاملات پیش آئیں گے جن کی وجہ سے سب ارتفاقات موجود ہو جائیں گے۔ اس لئے کسی قوم میں انصاف کی بادشاہی کا پیدا ہونا اور بہت سی قوموں میں انصاف کی خلافت (یعنی بین الاقوامی حکومت) کا پیدا ہونا انسانی نوع کی خواہش کے مطابق ہے۔

اب سمجھنا چاہئے کہ انسان میں (۱) التطلع الی جبروت (۲) التشبہ بالملکوت (۳) ارتفاقات کو کمال تک پہنچانے کی تمام صفات ہیں اور رسول اللہ ﷺ لوگوں کو تطلع الی الجبروت کا سبق اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے، شعائر اللہ کی تعظیم کرنے اور التشبہ بالملکوت کا سبق آپس میں ایسے بلند اخلاق کے پیدا کرنے سے سکھاتے ہیں جن کا فائدہ خاص انہی کو نہیں پہنچتا بلکہ عام انسانی نوع کو پہنچتا ہے اور اس کے بعد ان کی ذات کو بھی پہنچے گا کیونکہ وہ بھی تو انسانی نوع کے افراد میں سے ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ ارتفاقات کی تعلیم بھی دیتے ہیں (یعنی جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے دنیا اور آخرت میں پیدا کی ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ فائدے کم سے کم وقت اور تھوڑی طاقت خرچ کر کے کیسے حاصل کئے جائیں اس طرح کہ ملائکہ ان کے کام کو دیکھ کر تعجب کریں) یہ تینوں باتیں تفصیل سے کسی بھی شریعت میں بیان نہیں کی گئیں۔

۱۵ انسان کی تشریح اور اس کے مختلف مقامات میں مختلف مرتبے اور اس کے اچھے اعمال کا بیان

ترتیب وار رکھی ہوئی چیزوں میں جب کوئی چیز اثر کرے گی تو اس چیز کا اثر، ترتیب وار تمام چیزوں میں ان کی استعداد اور لیاقت کے موافق ظاہر ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے مختلف رنگدار شیشوں کو ترتیب وار رکھا جائے اور پھر ایک شیشے کے سامنے موم جلائی جائے۔ اس موم کی روشنی تمام شیشوں میں ان کے رنگوں کے موافق ظاہر ہوگی۔ ظاہر میں تمام شیشوں میں جدا جدا روشنی نظر آئے گی لیکن ہر عقلمند ایسا ہی کہے گا کہ جو روشنی پہلے شیشے میں ظاہر ہوئی وہ ہی تمام شیشوں میں نظر آتی ہے۔

اس بات کے سمجھنے کے بعد انسان کی حقیقت کی طرف رجوع کرنا چاہئے انسان چار چیزوں سے بنا ہوا ہے (۱) بدن (۲) ہوائی روح (۳) نفسِ ناطقہ (۴) ملکوتی روح (یعنی الٰہی روح۔ ملکوتی روح اور الٰہی روح ایک ہی چیز کے نام ہیں) حظیرۃ القدس میں انسانی نوع کا امام ہے جسکو النوع یا انسان کبیر یعنی بڑا انسان کہا جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو نوع انسانی کے امام کے بے شمار عکس ظاہر ہوئے جس طرح آئینہ میں ہمارے عکس ظاہر ہوتے ہیں ان عکسوں میں ان تمام صفات کے عکس بھی آگئے جو اس بڑے انسان میں ہیں۔ ان میں حظیرۃ القدس کے ملائکہ کی روحانی طاقت اور نیچے طبقہ والے ملائکہ کی روحانی طاقت کے عکس بھی آگئے اور جو ستارے اس دنیا کی چیزوں پر اپنا اثر پیدا کرتے ہیں ان کی طاقت کے عکس بھی آگئے۔ اسی طرح بڑے انسان کے دل پر جو اللہ تعالیٰ کی تجلی پڑتی ہے اس کا عکس بھی ان عکسوں میں آگیا۔ ان عکسوں کو ملکوتی روح کہا جاتا ہے یہ ملکوتی روحیں ہر انسان کی جدا جدا ہیں۔ پھر ایک طویل عرصہ کے بعد ملکوتی روحوں کے عکس عالم مثال کے تختہ پر آئے۔ دونوں عکسوں میں اتنا ہی فرق ہے جیسے چھوٹی تصویر کو بڑا اور بڑی تصویر کو چھوٹا کیا جائے باقی کوئی چیز جو ان میں بڑھائی یا کم کی گئی ہو وہ دیکھنے میں نہیں آئے گی دونوں عکس ایک جیسے نظر آئیں گے۔ ان کا آپس میں ایسا ہی تعلق ہے جیسے روح اور جسم کا۔ یہ عالم مثال کا عکس ملکی روح کا جسم ہوگا اور ملکی روح اس کی روح ہوگی۔ اس کے بعد جب ماں کے رحم میں منی اور حیض کا خون اکٹھا ہوتا ہے اور ماں کا نفس اس کی تدبیر کرتا ہے تب اس میں دل اور دماغ اور جگر ظاہر ہوتے ہیں پھر بچے میں بدن کے واسطے سے ایک قسم کی لطیف ہوا تیار ہوتی ہے۔ یہ لطیف ہوا بدن کے لطیف اخلاط سے دل میں پیدا ہوتی ہے انسان میں جو سننے، دیکھنے اور دوسرے کاموں کی طاقتیں ہیں وہ اسی لطیف ہوا کی طاقتیں ہیں۔ اس لطیف ہوا کے ساتھ وہ عالمِ مثال میں پیدا شدہ نورانی روح چمٹ جاتی ہے جیسے سورج کی صورت آئینے کے ساتھ چمٹ جاتی ہے۔ اب وہ نورانی روح لطیف ہوا میں اثر کرے گی اور وہ لطیف ہوا اس نورانی روح میں اثر کرے گی۔ اس وقت اس نورانی روح کو نفسِ ناطقہ (یعنی فکر کرنے والا نفس) کہا جاتا ہے اور اس لطیف ہوا کو اس نورانی روح کا جسم اور اس نورانی روح کو اس کی روح سمجھنا چاہئے یہ دونوں کبھی بھی نہ اس دنیا میں اور نہ ہی جنت اور جہنم میں ایک دوسرے سے جدا ہوں گی۔ اس کے بعد یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ یہ لطیف ہوا جو انسان کے دل میں لطیف خلطوں سے پیدا ہوتی ہے اس کی طاقتیں جب کام کرتی ہیں تب کم ہوتی رہتی ہیں پھر اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بدن لطیف ہوا کو تیار کرتا رہتا ہے اس وقت اس لطیف ہوا کو نسمہ یا ہوائی روح یا

برقی روح کہا جاتا ہے۔ انسان کے بدن کو لطیف ہوا کا جسم اور لطیف ہوا کو اس کی روح سمجھنا چاہئے۔ انسان کی یہ ہوائی روح جو انسانی صورت میں باقی حیوانات سے جدا ہوئی ہے وہ نفسِ ناطقہ کے سبب ہوئی ہے ورنہ ہوائی روح تمام حیوانات میں ایک جیسی ہے اس کے بعد جب انسان کا بدن لطیف ہوا کے پیدا کرنے سے بالکل عاجز ہوگا تو وہ عاجزی ان کی موت ہے۔ بدن کے بیکار ہونے سے بعضے اس کو قبر میں دفن کرتے ہیں اور بعضے جلا دیتے ہیں اس وقت باقی بچی ہوئی لطیف ہوا اور نورانی روح انسان کے بدن سے جدا ہوتی ہے پھر نورانی روح اس کو اس کی لیاقت کے موافق روشن جسم یا تاریک جسم عالم مثال سے دلاتا ہے اور وہ جسمِ لطیف ہوا کی کمی کو پورا کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح انسان کی اس کے مرنے کے بعد حفاظت کی جاتی ہے عالم مثال کا یہ بدن قیامت کے قائم ہونے تک قائم رہے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو یا تو دنیاوی جسم دے گا یا ایسا جسم دے گا جو دنیاوی جسم سے بھی مناسبت رکھے گا اور عالمِ مثال والے جسم سے بھی۔

انسان کی حقیقت سمجھنے کے بعد دو باتیں سمجھنا چاہئیں (۱) ایک یہ کہ دنیا میں انسان مذکورہ بالا اجزاء کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے۔ انسان کے مرنے کے بعد دنیا والے بدن کے علاوہ باقی تین اجزاء کے مجموعہ کو انسان کہا جائے گا۔ اس کے بعد انسان ترقی کر کے جب اس درجہ کو پہنچے گا جہاں انسان کی ہوائی روح پہنچ نہیں سکتی بلکہ فقط اس کا نفسِ ناطقہ پہنچ سکے گا تو وہاں انسان ملکوتی روح اور نفسِ ناطقہ کو کہا جائے گا۔ اسی طرح جب انسان ترقی کر کے وہاں پہنچے گا جہاں اس کا نفس ناطقہ بھی نہیں پہنچ سکتا تو وہاں انسان فقط ملکوتی روح کو کہا جائے گا۔ اور ملکی روح اور روحِ الٰہی ایک ہی چیز ہے تو یہ ذات پاک وہاں پہنچی جہاں کا خمیر تھا۔ یہ ہے مطلب انا الله وانا اليه راجعون کا۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان کے یہ چار اجزاء ترتیب وار ہیں تب جو چیز ملکوتی روح میں ظاہر ہوگی وہ نفس ناطقہ میں بھی اس کے مزاج کے موافق ظاہر ہوگی اور جو چیز نفس ناطقہ میں ظاہر ہوگی وہ ہوائی روح میں بھی اس کے مزاج کے موافق ظاہر ہوگی۔ اور جو چیز ہوائی روح میں ظاہر ہوگی وہ بدن میں بھی اس کی قابلیت کے موافق ظاہر ہوگی۔ پس انسان کے ہر ایک جز میں سے اگرچہ ظاہر میں جدا جدا صورت نظر آئے گی لیکن حکیم کی نظر میں وہ ایک ہی چیز ہے۔ پس سمجھنا چاہئے کہ تجلی جو انسانی نوع کے امام پر پڑتی ہے وہ ملکوتی روح پر چمکتی ہوئی اور ترتیب وار نیچے اترتی ہوئی بدن تک پہنچتی ہے بدن پر عمل کرنے کے بعد پھر جیسے نیچے اتری تھی ایسے ہی چڑھتی ہوئی ملکوتی روح تک پہنچے گی یہ انسانی فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے۔ پس تمام ارتفاقات سے بہتر ارتفاق وہ ہے کہ انسان جب کوئی کام بدن سے کرے تو اس کام کا اثر ملکوتی روح تک پہنچے۔ اور

سب سے بُرا ارتفاق وہ ہے کہ انسان جب کوئی کام بدن سے کرے تو اس کام کی روح کو اس کی ہوائی روح بھی قبول نہ کرے۔ جیسے زنا اور چوری جس پر انسان کو آخر پشیمان ہونا اور پچھتاوا کرنا پڑتا ہے۔ جو جہنم کی زندگی ہے۔

اس سے اچھا کام وہ ہے جس کی روح کو انسان کی ہوائی روح قبول کرے لیکن اس کا نفسِ ناطقہ اور الٰہی روح قبول نہ کرے جیسے بڑھئی کے پیشے اور دوسرے ہنر کہ لوگوں کو ان ہنروں کی اپنی زندگی کے لئے ضرورت بھی ہے لیکن ان کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے انہیں کیا جاتا اور جیسے وہ کام جن سے انسان کا تعلق عالم مثال میں فقط جنوں سے ہوتا ہے اور ملائکہ کے ساتھ نہیں ہوتا۔

اس سے بھی زیادہ اچھا کام وہ ہے جس کو انسان کا نفسِ ناطقہ بھی قبول کرے لیکن اس کی الٰہی روح قبول نہ کرے یہ عقلی بات ہے ورنہ اس کی ظاہر میں کوئی بھی مثال موجود نہیں۔

سب سے بہتر کام وہ ہے جسے انسان کی ملکوتی روح بھی قبول کرے کیونکہ وہ عمل ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا اور اس سے اسے انتہائی خوشی حاصل ہوگی جس سے زیادہ خوشی پہنچنے کا امکان ہی نہیں جب انسان میں اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے فائدہ حاصل کرنے کے وقت مذکورہ چار اخلاق ہوں گے اور انسان کا نفسِ ناطقہ شعائر اللہ کی عزت کرنے سے اللہ کی طرف دیکھنے والا ہوگا تب اس کی انانیت بھی کمال کو پہنچے گی اور اس کے کاموں کی روح بھی اس کی الٰہی روح تک پہنچے گی۔

۱۶۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کا خلاصہ:

پندرھویں فائدہ میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان کے سمجھنے کے بعد یہ جاننا چاہئے کہ ہم جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی قوم کو راستہ دکھانے والے اور ان کو پاک کرنے والے ہیں اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو ارتفاقاتِ صالحہ یعنی اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے اوزاروں کے ذریعہ تھوڑے وقت میں کم طاقت خرچ کرنے سے بہت سا فائدہ حاصل کرنے کا ایسا طریقہ سکھاتے ہیں جس سے ان کاموں کی روح ملکوتی روح تک پہنچتی ہے اور مذکورہ بالا چار اخلاق بھی ان میں پیدا کرتے ہیں اور شعائر اللہ کی تعظیم کرانے سے اللہ تعالیٰ کی تجلی کی طرف توجہ کرنا بھی سکھاتے ہیں پھر جب آپ کی قوم ہدایت پر آجائے گی اور پاک ہوجائے گی تو آپ ان کو حکم کریں گے کہ دنیا کی اقوام کو بھی اس تعلیم اور تہذیب پر اکٹھا کریں جس پر وہ ہیں لیکن اس تعلیم وتہذیب کا ان کو ایسا آسان طریقہ سکھائیں گے کہ وہ آسانی سے سکھا سکیں اور اس کام کو

رسول اللہ ﷺ کا کام سمجھا جائے گا۔ یہ معنیٰ ہیں خلافت قائم کرنے کے۔

اس معنیٰ سے رسول اللہ ﷺ، اور ان کے بعد ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں سے یہ کام اللہ تعالیٰ نے پورا کیا اور ان دونوں خلفاء کے کام کو بھی رسول اللہ ﷺ کا کام سمجھا گیا۔ پس اس معنیٰ سے رسول اللہ ﷺ نے ارضِ مقدسہ (پاک زمین) کو جس کا اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا ابراہیمی ملت کی روشنی سے روشن کیا اور مکہ معظّمہ، بیت المقدس اور مدینہ منورہ کی مسجدوں کو اس تعلیم کا مرکز بنایا۔ اور قیصر وکسریٰ کی دو بڑی حکومتوں کو برباد کر کے ان کی رعایا کو دو راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ وہ راستے یہ ہیں کہ یا تو وہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے کو اختیار کر کے اسلامی اجتماع میں داخل ہوجائیں یا ذمی بن کر اسلامی اجتماع کو خراج تحسین دے کر ان کے حکم کے فرمان بردار رہیں اور اسلامی دین کی جو خاص نشانیاں (شعائر اللہ) ہیں ان کی بے حرمتی نہ کریں۔

رسول اللہ ﷺ کے سوا جن لوگوں نے آج تک خلافتیں قائم کی ہیں ان سب سے کامل خلافت وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے قائم کی اور اس کا پروگرام اللہ تعالیٰ نے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں سے پورا کیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو انسانی نوع کے لئے ایک مقدس مثال بنایا ہے کہ ان کی ہمت سے ایک ایسی خلافت قائم ہوگئی جس کو پانچ سو برس تک آپ کی قومِ قریش نے چلایا اور دوسرے پانچ سو برس دوسری اقوام نے چلایا جنہوں نے آپ کے دین کو سچے دل سے قبول کیا۔ سورہ جمعہ میں آیت ۲ سے ۴ تک اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ ان آیات سے آخرین کے لفظ سے مطلب فارس، روم، ہندوستان اور ترک ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو دنیا میں پھیلانے کے لئے حکومتیں قائم کیں۔ اس کے بعد جب بھی انسانی نوع کا نظام ارتفاقات میں ترقی کرنے سے بدلتا رہے گا تو حکومتوں کی صورت بھی انسانی اجتماع کے موافق ضرور بدلتی رہے گی۔

ہزار سال کے بعد جب لوگوں کا نظام ارتفاقات میں ترقی کرنے سے بدلا تو مسلمانوں کے رہنما اپنے پرانے طریقہ کو بدل نہ سکے۔ اس لئے ان کی شان وشوکت فنا ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جب ہمیں امام ولی اللہ دہلوی کے طریقہ پر چلنے سے دین کی سمجھ پیدا ہوئی تب ہم نے سمجھا کہ ہزار سال کے بعد جو مسلمانوں کی شان وشوکت فنا ہوئی اس میں قصور ہمارا ہی تھا۔ اللہ اور اس کے رسول کے تعلیم میں کوئی قصور نہ تھا۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۠ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝

تفسیر سُورۃ الفاتحہ

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿١٥﴾

(ترجمہ) سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا بڑا مہربان نہایت رحم والا۔ مالک ہے، روز جزا کا۔ تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں دکھا ہم کو راستہ سیدھا۔ راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے فضل فرمایا نہ ان کا جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔

سورۃ فاتحہ کے مختلف نام اور ان کی مختصر تشریح

سورۃ فاتحہ کے نام حدیث کی کتابوں میں بہت سے بیان کئے گئے ہیں جن میں سے زیادہ مشہور سورۃ فاتحہ ہے کیونکہ یہ سورۃ قرآن کریم میں سب سے پہلی ہے۔

دوسرا نام اُم الکتاب ہے یعنی قرآن کریم میں جتنے بھی مقاصد بیان کئے گئے ہیں ان سب کا خلاصہ اس سورت میں ہے گویا کہ یہ سورت قرآن شریف کے مقاصد کی فہرست ہے قرآن شریف کے دیکھنے سے انسان کو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن شریف کے نازل کرنے کا اصلی سبب کیا ہے؟

اس سورت کا حاصل مطلب:

یہ جہان جو ترتیب وار پیدا ہوا ہے اور آخر میں انسان پیدا ہوا ہے اس کا جو نظام چل رہا ہے اس کی حکمت کی طرف اس سورت میں اشارہ کیا گیا ہے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ انسانی فطرت اور انسانی حقیقت جو اس جہان میں ہے وہ خواہش کرتی ہے کہ انسانوں کی سب

قومیں آپس میں جمع ہو جائیں اور جو اس فطرت کو چھوڑے گا وہ اس دنیا میں بھی ناکام ہے اور آخرت میں بھی اس کے نتیجہ کے طور پر ناکام ہوگا۔

اب یہ بات ظاہر ہے کہ انسانی فطرت کو سمجھنے والا فقط وہ آدمی ہو سکے گا۔ جس کے طبیعت میں پیدا ہونے کے وقت سے سوچنے سمجھنے کی قابلیت رکھی ہوئی ہوگی اور وہ ہر وقت چیزوں کی حکمت کی طرف خیال کرتا ہوگا۔

چونکہ سورۂ فاتحہ قرآن کریم کا خلاصہ ہے اس لئے سورہ فاتحہ سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوگا کہ قرآن ایسے لوگوں کی جماعت اکٹھی کرنا چاہتا ہے جس کے لئے سب سے ضروری بات یہ ہوگی کہ وہ انسانی فطرت کو سمجھے اور اس کے مطابق کام کرے۔ پھر جب ایسی جماعت پیدا ہو جائے تو قرآن اس کو مرکزی طاقت ٹھہرائے گا تا کہ وہ انسانیت کو فطرت کے موافق چلائے اور اس طرح قرآن اس کو نمونہ بنائے گا تا کہ دوسرے ان کو دیکھ کر ترقی کریں۔

اللہ اس پاک ذات کا نام ہے جو ہمیشہ تھا اور ہمیشہ رہے گا اور کوئی بھی چیز اس کے ارادہ کے بغیر نہ وجود میں آسکتی ہے اور نہ باقی رہ سکتی ہے اور اس ذات کو ہر چیز کا علم ہے۔

پھر یہ نام اللہ کا ذاتی نام ہے صفاتی نہیں۔ لیکن جیسا کہ بہت سے ذاتی ناموں میں صفت کا لحاظ ہوتا ہے جیسے زید میں زیادت کا، عمرو میں عمارت کا اور محمد میں حمد کا، اسی طرح اللہ کے نام میں وَلَهَ الصَّبِىُّ اِلَىٰ اُمِّهٖ (یعنی بچہ گھبرا کر ماں کی طرف بھاگا) اور وَلَهت الْاُمُّ اِلىٰ وَلَدِهَا (یعنی ماں کا دل اس کے بچے کی طرف کھنچ گیا) کا لحاظ کیا گیا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ بچہ کا ماں کی طرف کھنچنا اور ماں کا اپنے بچے کی طرف کھینچ جانا محبت کی وجہ سے ہوتا ہے

پس اللہ کو اللہ کے نام سے اس لئے پکارا جاتا ہے کہ وہ تمام خلق کا محبوب اور پیارا ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اللہ کی صفتیں بہت ہیں لیکن اس سورۃ میں خاص طور پر یہ چار صفتیں بیان کی گئی ہیں (۱) رَبُّ العٰلمین (۲) الرَّحمٰن (۳) الرَّحیم (۴) مَالِکِ یوم الدِّین کیونکہ انسانی فطرت اور پیدائش ان ہی صفات سے کمال کو پہنچتی ہے۔

عَالَمِیْنَ جمع عالم کی ہے عالم کے لفظ کے تین معنیٰ مشہور ہیں (۱) اللہ کے سوا جتنی چیزیں اور جو بھی مخلوق ہے (۲) تمام مخلوق کے مختلف اقسام (۳) انسانی جماعت کی جتنی بھی اقوام ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فرمایا ہے اَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ (یعنی میں نے تم کو تمہارے زمانہ کی سب اقوام پر فضیلت دی)

عام مفسر پہلا اور دوسرا معنیٰ اختیار کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کمالات تمام مخلوق

میں ظاہر ہوئے ہیں اس لئے اللہ کی تعریف ان تمام کمالات کی وجہ سے کرنی چاہیئے۔

ہم تیسرے معنیٰ کو پسند کرتے ہیں کیونکہ قرآن کریم رسول اللہ ﷺ پر جو تمام انبیاء کے آخر میں آنے والے ہیں نازل ہوا ہے۔ ہر نبی کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی جماعت کو کمال تک پہنچائے۔ تمام انبیاء کے اخیر میں آنے والے نبی کا یہ کام ہے کہ وہ تمام اقوام کو انسانی فطرت کے نظام کے موافق کمال تک پہنچائے، پس قرآن کا مقصد بھی یہی ہونا چاہیئے: کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو اس کے موافق ہی کام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

پھر جب کہ سورۃ فاتحہ قرآن کریم کا خلاصہ ہے **رب العٰلَمِین** کے لفظ سے مراد بھی تمام قومیں لینی چاہئیں اور اللہ کو رب العالمین اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ ان کا پالنے والا ہے یعنی پیدا کرنے سے لے کر ان کی فطرت کے موافق ان کو کمال تک پہنچانے والا ہے۔ عالمین کے لفظ سے اس سورت میں یہی معنیٰ مراد ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے یہ بات یاد رہے کہ نبوت کے دو درجے ہیں۔

نبوّت کے درجات

نبوت کا ایک درجہ یہ ہے کہ قوم کو انسانی فطرت کے موافق کمال تک پہنچایا۔ یہ درجہ رسول اللہ ﷺ کو پہلے عطا کیا گیا اور آپ پر یہ کام رکھا گیا کہ آپ قریش کو اور جو قبائل ان کے ارد گرد رہتے تھے ان کو کمال تک پہنچائیں اور آپ پر سورہ اقراء نازل کی گئی تا کہ آپ اس میں دکھائے ہوئے راستہ کے موافق قوم کو تعلیم دیں۔

نبوت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ تمام اقوام کو ابراہیمی مِلت پر جمع کریں کیونکہ اس کے بغیر انسانی نوع کی فطرت کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔

نبوت کے پہلے درجہ کے موافق سورۂ اقرأ میں **اقرأ باسم ربک** (یعنی تو اپنے پالنے والے کے نام سے پڑھ) کہا گیا ہے۔ **اقرأ باسم رب العٰلمین** نہیں کہا گیا کیونکہ سورۂ اقرأ کے نزول کے وقت رسول اللہ ﷺ پر اپنی قوم کو راہ راست پر لانے کا کام تھا اور انسان اپنی قوم کو تب پہچانتا ہے جب اس کے نفس کے تعلقات جو اس کی قوم سے اس کے باپ دادوں کے واسطے سے ہیں ان کو سمجھتا ہو۔ پس اپنی قوم کو پہچاننے کا دارومدار انسان کا نفس ہوا۔ پس **اقرا باسم ربک الذی خلق** کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ تو اپنے پالنے والے اور اپنے باپ دادوں اور اپنی قوم (جن سے تیرے تعلقات تجھ کو اپنی طرف نظر کرنے سے سمجھ میں آتے ہیں) کے پالنے والے کے نام سے پڑھ جس نے تجھ کو اور ان کو پیدا کیا ہے۔

نبوت کے دوسرے درجہ کے موافق سورت فاتحہ میں **الحمد اللہ رب العٰلمین** کہا گیا ہے کیونکہ قرآن کے نازل کرنے کا اصلی مقصد نبوت کے دوسرے درجہ کے کام کو پورا کرنا تھا۔ پس جو سورت قرآن شریف کا خلاصہ ہے اس میں بھی ایسا ہی لفظ استعمال کرنا چاہیئے جو نبوت کے دوسرے درجہ کے مناسب ہو۔

ایک علمی بحث

جیسا کہ سورۂ فاتحہ سے نبوت کے دوسرے درجہ کی طرف اور سورۂ اقرأ سے نبوت کے پہلے درجہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس لئے سورہ فاتحہ کو قرآن کے شروع میں رکھنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو نبی بنا کر بھیجنے سے اصلی مقصد نبوت کے دوسرے درجہ کے کام کو پورا کرنا ہے اور سورۂ اقرأ کو آخر میں رکھنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا پہلا درجہ آپ کی نبوت کے دوسرے درجہ کو کمال تک پہچانے کا سبب ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اسلام بین الاقوامی تحریک کا نام ہے۔ عربی تحریک کا نام نہیں۔ عربی تحریک بھی اس میں تھی لیکن اس کو بین الاقوامی تحریک تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا گیا تھا۔ اسی بین الاقوامی تحریک کے امام ابراہیم علیہ السلام ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآن میں امام کا لفظ عطا فرمایا۔ اس کے بعد ابراہیم علیہ السلام کی اولاد آپ کی امامت کو پھیلانے کے لئے اور دوسری قوموں کو ابراہیمی دین میں داخل کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔

ابراہیمی تحریک کا مقصد: ابراہیم علیہ السلام کی تحریک کا مقصد انسانی نوع کو ان کی فطرت کے موافق کمال تک پہنچانا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام کی تحریک میں معاشی اور ذہنی دونوں ترقیاں داخل ہیں۔ اسی لئے ابراہیمی تحریک بین الاقوامی تحریک ہے۔

ہمارے زمانے کے بعض سیاستدان دینی تحریک اور سیاسی تحریک کو ایک دوسرے سے علیحدہ دو چیزیں سمجھتے ہیں اور دینی تحریک کو خیالی تحریک (جس کا فائدہ بظاہر دیکھنے میں نہیں آتا) سمجھتے ہیں۔ اور سیاسی تحریک کو حقیقی تحریک (جس کے فوائد بیشمار دیکھنے میں آتے ہیں) سمجھتے ہیں۔ یہ سیاستدان جب سنتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام بین الاقوامی تحریک کی بنیاد رکھنے والے تھے تو اس طرف کوئی خیال نہیں کرتے کیونکہ یہ تحریک ان کے نزدیک محض دینی ہے۔ امام سندھیؒ فرماتے ہیں ہمارا کہنا ہے کہ ان سیاستدانوں کا خیال غلط ہے کیونکہ انسانیت اول سے آخر تک ایک چیز ہے اس کو دو میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ پس انسانی بین الاقوامی تحریک کو بھی دو قسموں یعنی دینی اور سیاسی تحریک میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اگر دین کی طرف اپنے کو منسوب کرنے والے ذہنی ترقی پر اکتفا

کریں گے اور معاشی ترقی سے منہ موڑیں گے اور سیاست دان معاشی ترقی پر کفایت کریں گے اور ذہنی ترقی سے اعراض کریں گے تو یہ ان دونوں جماعتوں کا قصور ہے۔ ان دونوں جماعتوں کو پوری انسانیت کی طرف خیال کرنا چاہئے۔ ان کو انسانیت کے فقط ایک حصہ کی طرف خیال نہ کرنا چاہئے ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جس طرح بعض آدمی لوہار کا کام کرتے ہیں اور بعض بڑھئی کا۔ اور کوئی کھیتی کا لیکن سب سمجھتے ہیں کہ ان تمام کاموں کی انسانی اجتماع کو ضرورت ہے۔ ان پیشوں کو انہوں نے آپس میں اس لئے بانٹ لیا ہے کہ ہر ایک آدمی تمام پیشوں اور کاموں کو اکیلا نہیں کرسکتا۔ اسی طرح ضروری ہے کہ بعض لوگ ذہنی ترقی کا خیال کریں اور کوئی علم سیکھنے، سکھانے اور فطرت کے موافق اخلاق کو درست کرنے میں لگ جائے اور بعض آدمی سیاسی کاموں میں اور ملکوں کو فتح کرنے اور ان کے انتظام کرنے میں لگ جائیں لیکن ہر ایک جماعت دوسری جماعت کے کام کو بے کار و معمولی نہ سمجھے۔ کسی وقت ایک جماعت کے کام کی زیادہ ضرورت پڑے گی اور دوسرے وقت میں کسی دوسری جماعت کے کام کی زیادہ ضرورت ہوگی۔

ایک مثال

ایک عالمِ اپنے علم کو انسانی نوع کے لئے فائدہ مند سمجھتا ہے۔ پھر اس کو جو بھی آدمی ملتا ہے اس کو سکھاتا ہے اور اپنے شاگردوں کو اکٹھا کر کے ان کی ایک جماعت بناتا ہے تاکہ سب مل کر ایک دوسرے کی مدد کریں۔ پس یہ آدمی اگر چاہے کہ اس کے علم کو کوئی بھی نہ بگاڑے اور اس کی بنائی ہوئی جماعت کو کوئی برباد نہ کرسکے تو کیا اس کے لئے یہ بات ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی جماعت میں فوجی طاقت بھی پیدا کرے پس علم کے شائع کرنے کے لئے حکومت کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔

اسی طرح ابراہیم علیہ السلام جس دین کے امام ہیں اس میں پوری انسانی فطرت کا بیان ہے اس میں جس طرح ذہنی ترقی کا خیال رکھا گیا ہے اسی طرح سیاسی ترقی بھی اس میں شامل اور داخل ہے۔

عام تاریخ دانوں کی غلط فہمی

عام تاریخ دان لکھتے ہیں کہ قوموں کو متحد کرنے کی تحریک سکندر مقدومی یا اس جیسے دوسرے بادشاہوں کے زمانہ سے جو اس سے کچھ عرصہ پہلے گزرے ہیں شروع ہوئی۔ ہمارے استاذ مولانا عبیداللہ سندھی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ ہم نے یہ تحقیق کی ہے کہ اس تحریک کو ابراہیم علیہ السلام نے پیدا کیا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو قوموں کے امام ہونے کا خطاب عطا فرمایا اور

آپ کی اولاد بھی جن میں بڑے رسول اور نبی گزرے ہیں آپ کی وفات کے بعد آپ کی امامت کو قوموں میں پھیلانے کے لئے کوشش کرتے ہیں۔

حقیقت میں رسول اور انبیاء ہی قوموں کو اکٹھا کرنے والی تحریکوں کے امام ہیں۔ سیاست دان فلسفی اگر انبیاء کے طریقہ پر چلیں گے اور جیسا کے انبیاء نے قوموں کو اکٹھا کیا اسی طرح یہ بھی کریں گے تو یہ ان کے جانشین اور وارث ہوسکتے ہیں اور اس کے بعد ان کو انبیاء کے دوسرے درجہ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

سو جس آدمی کو دین کی سمجھ ہوگی اور وہ انسانی اجتماع کو سمجھتا ہوگا۔ اور سیاست دانوں اور فلاسفروں نے انسانیت کی جو خدمت کی ہے اس کی بھی اسے خبر ہوگی تو وہ انبیاء اور رُسل کے سوا کسی انسان کو بھی انسانی اجتماع کا امام نہیں ٹھہرائے گا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

جب کہ تمام قوموں کو جمع کرنے کی تحریک ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوئی اور قرآن اس تحریک کو کمال تک پہنچانا چاہتا ہے کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے اور سورۂ فاتحہ قرآن کا خلاصہ ہے اس کے موافق اس سورت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر رب العٰلمین کی صفت سے کیا گیا ہے جس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام قوموں کو پالنے والا ہے دوسری طرف انسان اپنے پالنے والے اور اپنے کو اس کا پورا غلام سمجھتا ہے اور جانتا ہے اس لئے **الحمدللّٰہ رب العالمین** کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ قوموں کو جمع کرنے کا جو نظام اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے اور اس نظام کو لوگوں کی فطرت کے مطابق بنایا ہے جس سے اچھا نظام انسان کے خیال میں بھی نہیں آسکتا اس نظام میں جتنی بھی خوبیاں ہیں وہ سب اس نے پیدا کی ہیں اور وہ ہی اس کی نگہبانی کرنے والا ہے۔ اس لئے تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔

پس انسان کو اپنی تمام طاقت اس نظام کو سمجھنے اور اس کو فطرت کے قوائد پر قائم کرنے میں خرچ کرنا چاہئے اور فطرت کے قواعد سے اس کو بالکل ہٹنا نہ چاہیئے۔ اگر کسی انسان کو موجودہ وقت کے نظام سے اچھا نظام سمجھ میں آئے تو اس کو وہ نظام قائم کرنا چاہئے کیونکہ اگر وہ حقیقت میں اچھا نظام ہوگا تو وہ ترقی شدہ فطری نظام ہے جس طرح کہ آج انسانیت دن بدن ترقی کرتی رہی ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

بعض حکماء (جیسے قاضی عیاض) فرماتے ہیں کہ اس جہان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کامل حکمت سے پیدا کیا ہے بس اس جہان سے زیادہ اچھا جہان ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اس جہان میں انسانی

فطرت بھی داخل ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا پس اس میں بھی کوئی نقصان نہیں۔

لیکن بعض دوسرے حکماء (امام غزالی) فرماتے ہیں کہ اس جہان سے زیادہ اچھا جہان بھی ہوسکتا ہے دوسری طرف ایک چیز دوسری چیز سے زیادہ اچھی تب ہوگی جب اس چیز میں کچھ نقص ہو اور دوسری میں نہ ہو۔ پھر تم کیسے کہتے ہو کہ انسانیت کے اس نظام سے دوسرا کوئی عمدہ نظام خیال میں بھی نہیں آسکتا؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی صفات بے شک کسی ایک حد تک کھڑی نہیں ہوتیں۔ پس اگر اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت (مثلاً اللہ کی قدرت) ایک دور میں ایک صورت میں ظاہر ہوگی تو اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت دوسرے دور میں اس سے عمدہ صورت میں کبھی بھی ظاہر نہیں ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر چیز پر ہے لیکن ہمارا یہ مطلب ہے کہ موجودہ دور میں اللہ تعالیٰ نے چیزوں کو جس خاص فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اس فطرت سے عمدہ فطرت ان چیزوں میں نہ ہوسکے گی۔ ان چیزوں کے سوا دوسری چیزوں میں جو اس دور میں موجود نہیں ہیں ان میں موجود ہوسکے گی لیکن یہ موجودہ چیزیں ان چیزوں کے پیدا ہونے کے لئے راستہ تیار کرنے والی ہیں جیسے ہم چلتے ہیں تو ہمارا موجود قدم آنے والے قدم کے موجود ہونے کے لئے راستہ تیار کرنے والا ہے۔

جو لوگ امام غزالی کا نام لے کر اعتراض کرتے ہیں ان کو موجودہ دور کی چیزوں کی پوری خبر نہیں حالانکہ وہ خود ان میں ہیں پس اس دور کے بعد آنے والے دوسرے دور کی کیسے خبر پڑے گی۔ پھر وہ کیسے کہتے ہیں کہ اس جہان سے دوسرا عمدہ جہان بھی ہوسکتا ہے۔ ان لوگوں کو حکمت کی خبر نہیں ہے یہ فقط خیالی پلاؤ پکانا جانتے ہیں اس کے بعد جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا اس جہان سے عمدہ جہان بھی ہوسکتا ہے تب وہ بغیر سوچے سمجھے فقط اللہ تعالیٰ کی ابدی اور ازلی صفات کا خیال کر کے کہتے ہیں کہ ہاں اس جہان سے عمدہ جہان بھی ہوسکتا ہے۔ اگر ان لوگوں کو بنانے کی طاقت ہوتی اور جو بات ان کے خیال میں آئی ہے اس کے پیدا کرنے میں لگ جاتے تو ان کو اپنا خیال غلط دیکھنے میں آتا۔

پس ہم نے **الحمدللہ رب العلمین** کا جو معنیٰ بیان کیا ہے وہ اگر کسی مسلمان کے دماغ میں بیٹھ جائے تو وہ اس حکمت کو سمجھ کر دین کو سمجھ لے گا۔ اور اگر یہ معنیٰ دماغ میں نہ بیٹھے تو وہ کبھی ایک بات کہے گا اور کبھی دوسری۔ سیدھے راستے پر کبھی نہیں چلے گا۔

ویب : www.hikmatequran.org   ای میل : hikmatequran@gmail.com

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

باپ کی شفقت رحمان کی صفت کا ظہور ہے اور ماں کی شفقت رحیم کی صفت کا ظہور ہے۔

تمام دنیا کے باپ آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک جتنے بھی ہوں گے ان کو اکٹھا کیا جائے پھر ان کے دلوں میں جو اپنی اولاد کے ساتھ محبت اور شفقت ہے اس کو بھی یکجا کر کے دیکھا جائے تو رحمٰن کی رحمت اس سے سینکڑوں درجہ زیادہ ہوگی۔ اسی طرح اول سے لے کر آخر تک جتنی بھی مائیں ہیں ان کی رحمت سے رحیم کی رحمت کروڑوں حصے زیادہ ہوگی۔ اس لئے جس طرح باپ اپنی اولاد کو مار پیٹ کر مدرسہ میں علم حاصل کرنے کے لئے بھیجتے ہیں تاکہ بڑا ہونے کے بعد عزت کی زندگی بسر کر سکے اسی طرح رحمٰن کی یہ خواہش ہے کہ انسان ترقی کر کے انسانی نوع کے اچھے لوگوں میں سے ایک اچھا انسان بنے اور اس رحمت کا حقدار ہو جائے جو انسانی نوع کے لئے اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔ ان دونوں باتوں کو حاصل کرنے کے لئے رحمٰن نے قرآن سکھایا اور انسان کے پیدا ہونے کے بعد اس کو بولنا سکھایا اور حساب سکھانے کے لئے سورج اور چاند پیدا کیا اور اس کی طبیعت کو اپنے رب کی طرف رجوع ہونے اور اس کو سجدہ کرنے کے لئے درخت اور بوٹے پیدا کئے جیسا کہ اس کا بیان سورہ رحمٰن میں ہے پس یہ بات ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں انسان میں آسانی سے پیدا نہیں ہوسکتیں بلکہ مشکل سے پیدا ہوتی ہیں۔

ماں کی رحمت باپ کی رحمت کے برعکس ہے وہ اپنی اولاد کی آئندہ ترقی کی طرف نہیں دیکھتی بلکہ موجودہ راحت اور تکلیف کو دیکھتی ہے اس لئے سورۃ الشعراء میں آٹھ جگہ اللہ تعالیٰ نے کافروں اور مومنوں کا مقابلہ کر کے فرمایا۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٩﴾ یعنی بے شک تیرا پالنے والا زبردست (اور) نہایت رحم والا ہے۔ یعنی کافروں پر زبردست ہے اور ایمان والوں کے لئے نہایت رحم والا ہے۔ ان کو جنت میں داخل کرے گا جہاں ان کو کسی قسم کی بھی تکلیف نہیں پہنچے گی بلکہ وہ ہمیشہ راحت اور آرام میں رہیں گے۔

ماں باپ کی رحمت کے یہ معنیٰ بخاری، مسلم اور ترمذی کی حدیث میں بیان شدہ ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ”اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کئے۔ پھر ان میں سے ننانوے حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین پر اتارا۔ پس اس ایک حصے کی وجہ سے مخلوق ایک دوسرے پر رحم کرتی ہے اور جانور اپنے پیر کو اپنے بچے سے اٹھاتا ہے تاکہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔“

ان دونوں صفتوں کے بیان کرنے کا فائدہ:

ان دو صفتوں کو یہاں اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ انسان کی فطرت ایسی ہے جس کی وجہ سے

وہ ماں باپ اور ان کے رحم کا محتاج ہے اور اس سے ہی اس کی فطرت کمال کو پہنچتی ہے اور آخر میں وہ ماں باپ سے بے پرواہ ہوجاتا ہے۔ ہمارے ماں باپ ہم پر رحم کرتے ہیں اور ہم اپنی اولاد پر رحم کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ ان دونوں صفتوں کے بیان کرنے سے یہ بھی فائدہ ہے کہ چونکہ تمام نوعِ انسانی دونوں طرف سے ماں باپ کے رحم میں پوشیدہ ہے اس لئے جب انسان بڑا ہوتا ہے اور اس کے ماں باپ مرجاتے ہیں تو وہ اپنے دل میں دوسروں کو اپنے ماں باپ جیسا رحم کرنے والا سمجھتا ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفات کی اس کو خبر پڑتی ہے تو اس کے دل میں ماں باپ کے مرنے سے یا حادثوں اور آزمائشوں کی وجہ سے جو نا اُمیدی موجود ہوتی ہے وہ دُور ہوجاتی ہے اور اس طرح وہ اپنی فطرت کو کمال اور ترقی تک پہنچاتا رہے گا۔

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

جب اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ایک جیسی قابلیت اور استعداد والے کچھ آدمیوں کی طرف متوجہ ہوگی تو ضرور ان میں اختلاف پیدا ہوگا۔ کیونکہ ان کی پیدائش میں ایک حصہ حیوانیت کا بھی ہے۔ پس بعضِ آدمی ایسے بھی پیدا ہوں گے جو انسانیت کا خیال نہیں کریں گے بلکہ اپنی حیوانیت کے نشہ میں آکر اپنے آپکو اپنے جیسے دوسروں سے بڑا کرنا چاہیں گے۔ اور اپنے ہم جنسوں کو قتل کریں گے یا ان پر ظلم کریں گے۔ ملائکہ انسان کی پیدائش کی طرف نظر کر کے اس کی اس حالت کو سمجھ گئے اور عرض کرنے لگے کہ اے اللہ! کیا تو زمین میں ایسی مخلوق پیدا کرے گا جو اس میں فساد کرے گی اور خون بہائے گی؟ پس اختلاف کی صورت میں یا تو انسانیت کی ترقی رک جائے گی یا اللہ کی طرف سے اختلاف مٹانے کے لئے کوئی دوسری رحمت متوجہ ہوگی۔ اس رحمت کا نام انصاف ہے۔

اللہ کی رحمت کے بعد اختلاف پیدا ہونے کی مثال

جب بارش پڑتی ہے تو جنگل کے درخت گھنے ہوجاتے ہیں اور ان کی ٹہنیاں ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتی ہیں پھر اس خرابی کو مٹانے کے لئے لوگ ان ٹہنیوں کو کاٹتے ہیں تاکہ جنگل میں لوگوں کے لئے چلنا پھرنا آسان ہوجائے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ لوگوں کو انصاف کے بغیر نہیں چھوڑتا۔ کسی نہ کسی صورت میں ان کے درمیان فیصلہ کرتا رہتا ہے کبھی دنیاوی حکام کے ذریعے، کبھی بیماریوں اور مصیبتوں کی صورت میں اور کبھی انقلاب کی شکل میں۔ امام شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ کی حکمت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب انسان کوئی کام کرتا ہے تو وہ وقت اس کے کام کرنے کا ہے اور جب اس سے فارغ

ویب : www.hikmatequran.org ای میل : hikmatequran@gmail.com

ہوجاتا ہے تو اس وقت سے لے کر اس کام کے جزا یا نتیجہ کا وقت شروع ہوجاتا ہے اس کے بعد اگر انسانی فطرت کے قانون کی خواہش ہوگی تو ایک دم جزا و سزا آجائے گی اور اگر انسانی فطرت کے نظام میں جلدی جزا سزا آنے کی خواہش نہ ہوگی تو جلد جزا سزا نہ آئے گی۔

مثال کے طور پر بعضے کام ایسے ہیں جو تمام انسانی نوع کے لئے ضروری ہیں۔ یہ کام وہ ہیں جن کی قرآن ترجمانی کر رہا ہے ان کو اگر کوئی کرے گا تو ان کا فائدہ کام کرنے والے کو بھی پہنچے گا۔ اور تمام انسانی نوع کو بھی پہنچے گا اور اگر ان کو کوئی نہیں کرے گا تو اس کا نقصان اس کو بھی پہنچے گا اور تمام انسانی نوع کو بھی پہنچے گا۔ پس ایسے کاموں کا پورا فیصلہ تب ہوگا۔ جب تمام انسانی نوع زمین پر نہیں رہے گا۔ یہ وقت قیامت کا دن ہے۔

کئی کام ایسے ہیں جو ایک ملک کے لوگوں کے لئے ضروری ہیں کیونکہ اس ملک والوں کا فائدہ ان کاموں کے کرنے میں اور ان کا نقصان ان کاموں کے چھوڑنے میں ہے ان کاموں کا فیصلہ قیامت کے دن سے پہلے بھی ہوسکتا ہے لیکن اگر انسانی نوع یا اس ملک کے رہنے والوں کا فائدہ فی الحال ان کو جزا سزا دینے میں نہیں ہے تو ان کو پوری جزا سزا دینے میں دیر کی جائے گی جو قیامت کے دن تک بھی ہوسکتی ہے پھر قیامت کے دن ان کو جزا سزا دی جائے گی۔

بعض کام ایسے ہیں جن کے فیصلے دنیا کے حاکم، قاضی اور جج کرتے ہیں لیکن چوں کہ ان کو غیب اور بیرونی حالات کی خبر نہیں ہوتی اس لئے ان سے غلطی بھی ہوجاتی ہے یا ان میں سے بعض ظالم ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا فیصلہ صحیح نہیں ہوتا۔ ایسے کاموں کا فیصلہ بھی قیامت کے دن کیا جائے گا۔

مذکورہ بالا بیان سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی جزا و سزا فقط ظالم و مظلوم ہونے کی وجہ سے اور انسانیت کو فائدہ اور نقصان پہنچانے کی وجہ سے ہی ہوتی ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی بادشاہی فقط انسانی نوع کے لئے ہی ظاہر ہوتی ہے انسانوں کے علاوہ دوسری تمام مخلوق پر ان کے ارادے کے بغیر ظاہر ہوتی ہے پس سمجھنا چاہئے کہ اللہ کا حکم انسانوں میں انسانیت کی خواہش کی وجہ سے جاری ہوتا ہے۔

خدائی فیصلہ کا فائدہ

جب انسان کو اللہ تعالیٰ کی اس صفت کی خبر ہوگی تو وہ کسی ظالم کے ہاتھ سے اپنے حق کو ضائع ہوتے ہوئے دیکھ کر نا امید نہیں ہوگا بلکہ انسانی نوع کی ترقی کے لئے جو قاعدے اور قانون مقرر ہیں ان پر برابر چلتا رہے گا۔ اور جزا اور سزا کی امید رکھے گا۔

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ

اوپر گذر چکا ہے کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام قوموں کا پالنے والا ہے اور اس کی پرورش ایسی ہے جس طرح ماں باپ اپنی اولاد کی رحمت اور شفقت سے پرورش کرتے ہیں بلکہ دنیا میں جتنے بھی ماں باپ ہیں خواہ وہ انسان ہوں یا حیوان ان سب کی رحمت اور شفقت سے اس کی رحمت وشفقت سینکڑوں لاکھوں اور کروڑوں حصوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور وہی لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا اور مظلوموں کو ظالموں سے بدلہ دلانے والا ہے اور انسانیت کو اس کی حکومت کے سوا دوسرے کسی بھی بادشاہ کی ضرورت نہیں ہے تو جو بھی اس اللہ سے اپنا تعلق رکھے گا وہ صرف اسی کا غلام ہو کر رہے گا دوسروں سے آزاد رہے گا یہ معنیٰ ہے: **اِیَّـاکَ نَـعۡـبُـدُ** کا یعنی ہم تیرے ہی غلام ہو کر رہتے ہیں۔

غلام ہو کر رہنے کے معنیٰ ظاہر ہیں لیکن اس لفظ کو مجازی معنوں میں استعمال کرنے کی وجہ سے اس کے ظاہری معنیٰ چُھپ گئے ہیں اس لئے اس کو **اِیَّاکَ نستعین** سے واضح کیا گیا ہے۔

وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ

یعنی ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں تیرے سوا دوسرے کسی سے بھی مدد نہیں مانگتے۔ پس اگر کوئی آدمی ہماری کوئی ضرورت پوری کر کے ہم پر اپنے احکام جاری کرنا چاہے تو اس کو جاننا چاہیئے کہ ہم اس بات کو ہی نہیں مانتے کہ اس نے ہماری کوئی ضرورت پوری کی ہے اور نہ ہی اس کے حکم کے موجب چلیں گے اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ وہ ہمیں کچھ دیتا ہے تو نہ دے! ہم اپنی زندگی میں اللہ کی مدد کے سوا دوسرے کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ آدمی جس نے ہمیں کچھ دیا ہے یا ہماری کوئی ضرورت پوری کی ہے اس نے اگر اللہ کے حکم سے ایسا کیا ہے تو ہم اس کا شکریہ بجالاتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ اس نے اپنے رب کی تابعداری کی، نہ اس وجہ سے کہ ہم اس کے غلام ہو گئے ہیں۔

مطلب یہ کہ اس لفظ سے ہم کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ ہم اپنی ضرورتوں کے پورا کرنے میں اللہ کے سوا کسی پر بھی بھروسہ نہ کریں کیونکہ اگر ہم نے اس پر اعتماد کیا تو وہ ہمیں اپنا غلام بنا لے گا۔ اور ہماری آزادی چھین لے گا۔ پھر چونکہ ہماری ضروریات بے شمار ہیں اس لئے ہم کسی نہ کسی درجہ میں بہت سے انسانوں کے غلام بن جائیں گے۔ پس **اِیَّـاکَ نَسۡتَـعِیۡنُ** کو **اِیَّاکَ نَعۡبُدُ** کی تفسیر سمجھنا چاہیئے۔

حقیقی توحید کا بیان

سوال۔ ایک آدمی اپنی عقل سے سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا قدرت والا ہر ایک کو دیکھنے والا ہے لیکن وہ اپنی ضرورتوں کے پورا کرنے میں دوسروں پر بھروسہ کرتا ہے کیا ایسا آدمی موحد ہو سکتا ہے یا نہیں؟

جواب۔ امام شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی روشنی میں وہ آدمی ہمارے نزدیک قرآنی تعلیم کی رو سے مُشرک ہے۔ لیکن ہم ایسے شخص کو کافر نہیں کہتے کیونکہ اس کو کافر کہنے کے لئے ہمارے پاس شارع علیہ السلام کی طرف سے کوئی حکم نہیں ہے۔ مشرک کے لئے دنیا اور آخرت کی سزائیں جو بھی قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور موحد (جس کو ہمارے زمانہ میں آزاد کہا جاتا ہے) کے لئے دنیا اور آخرت کے جو فائدے قرآن میں بیان کئے گئے یں ان سب کا اصل ہم **اِیَّـاکَ نَسۡتَعِیۡنُ** کو ٹھہراتے ہیں۔

یہاں سورہ فاتحہ کا آدھا حصہ پورا ہو گیا۔ اس نصف میں دنیا کی تمام قوموں کو تعلیم دی گئی ہے کہ ان میں سے ہر ایک آدمی اپنے اندر ایسی صفتیں پیدا کرے اور اپنی ایسی حالت بنائے جس سے سمجھ میں آئے کہ وہ حقیقی معنیٰ میں دل وجان سے اللہ کو رب، رحمٰن، رحیم، مالک یوم الدین سمجھتا ہے اور اللہ کی ان صفات کے مطابق اس کی غلامی کر رہا ہے۔ سورۃ کے آخری آدھے حصہ میں تمام قوموں کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ سب مل کر ایک راستے پر چلیں جس کا بیان **اھدنا الصراط المستقیم** میں آئے گا۔

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ

یہ دعا ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ: جو اس نے ارادہ کیا ہے اس کو ظاہر کرے پھر **اھدنا الصراط المستقیم** کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ اے اللہ! ہم نے بین الاقوامی راستہ پر چلنے کا پکا ارادہ کر لیا کیونکہ انسانی فطرت اس پر چلنے کی خواہش کرتی ہے اور اسی سے وہ کمال کو پہنچے گی قرآن ہم کو جن کاموں کے کرنے کا حکم کر رہا ہے اور جن سے روک رہا ہے وہ تمام احکام اور ممنوعات اس بین الاقوامی راستہ پر چلنے کا حکم نامہ اور اس سے مخالف راستہ پر چلنے کے منع نامہ ہیں۔ پس بین الاقوامی راستہ پر چلنے اور انسانی فطرت کے موافق اور قرآن کے حکموں کے بموجب چلنے کے ایک ہی معنیٰ ہوں گے۔

لیکن اے اللہ! ہم ڈرتے ہیں کہ مبادا کچھ ایسی حالتیں پیدا ہو جائیں جو ہم کو اس راستہ پر چلنے سے روکیں اس لئے ہم تجھ سے دعا مانگتے ہیں کہ ایسی حالتوں کے پیدا کرنے کو روک اور اس

راستہ پر ہم کو چلا۔

یہ سوال اللہ سے اس لئے کرتے ہیں کہ جب ہم نے اس کو اس سورت کے شروع میں رب العٰلمین، رحمٰن، رحیم اور ایسا بادشاہ سمجھا جس کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے اور جس طرح بچہ اپنی شروع پیدائش میں اپنے ماں باپ پر بھروسہ کرتا ہے اس سے بھی زیادہ ہم نے اس پر بھروسہ کیا اور اپنے کو تمام مخلوق سے آزاد کیا تب اس وقت انسان کو پورا خیال اپنی فطرت کو کمال تک پہنچانے کو ہوگا اس لئے اس کو **اِھْدِنا الصِّراط المستقیم** سے سوال کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ انسان کی ضرورتیں بے شمار ہیں اور ان تمام ضرورتوں میں چوٹی کے درجے کی ضرورت یہ ہے کہ انسان جس جماعت میں ہو وہ جماعت بین الاقوامی درجہ کو چلانے والی ہو (یعنی خود قرآن پر چلنے والی ہو اور دوسری اقوام تک اسے پہنچانے والی اور ان میں قرآنی حکومت قائم کرنے والی ہو) اس لئے یہ سوال کیا گیا۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

یہ آیت تفسیر ہے **اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** کی۔ اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ اے اللہ! تو نے جن اپنے بندوں پر نعمت کی ہے انہوں نے ہم کو سکھایا ہے کہ اللہ سے جب اس کا بندہ یہ دعا مانگتا ہے تو وہ اس سے راضی ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہم کو ان بزرگوں کے حالات سے اس بات کا تجربہ بھی ہو گیا کیونکہ ان خالص بندوں نے تجھ سے یہی دعا مانگی اور اس راستہ پر چلے اور تو نے ان کو دنیا میں بھی کامیاب کیا اور آخرت میں بھی کامیاب ہوئے اس لئے اے اللہ! تو ہم کو ان بزرگوں کے راستہ پر چلا۔

اِھْدِنَا الصراط المستقیم کے بعد صراط الذین انعمت علیھم کے لانے کا یہ سبب بھی ہے کہ جیسے انسان میں مختلف اعضاء ہیں اور ان میں سے ہر ایک عضو کا جدا جدا کام ہے اور وہ کام دوسرے عضو سے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح انسان میں کچھ طاقتیں علم حاصل کرنے کی ہیں اور دوسری طاقتیں عمل کرنے کی ہیں پس انسان جب **اھدنا الصِّراط المستقیم** کہے گا تو اس کی علمی طاقتیں اس سیدھے راستے کی طرف خیال کرنے لگیں گی۔ اس کے بعد جب **صِرَاطَ الَّذِيْنَ انعمت علیھم** کہے گا تو اس کی عملی طاقتیں اس سیدھے راستے پر چلنے کے لئے تیار ہو جائیں گی پس سمجھنا چاہئے کہ اھدنا الصراط المستقیم کے کہنے سے انسان کا خیال تمام زندگی کے دستور العمل (پروگرام) کی طرف جائے گا۔ اور **صراط الذین انعمت علیھم** کے کہنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہوگا کہ مذکورہ بالا پروگرام تب پورا ہوگا جب انسان ایسی جماعت میں داخل ہو جن کی

فطری طاقتیں کامل ہوں جب تک انسان ایسی جماعت میں داخل نہ ہو تو اسے سیدھے راستہ پر نہ سمجھنا چاہئے پس ان دونوں آیتوں سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان پر اس کی انسانیت لازم کرتی ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان پر اس کی انسانیت لازم کرتی ہے کہ اس کے پاس سیدھا راستہ مقرر ہونا چاہئے اور اس کو ایسی جماعت ڈھونڈ کر اس میں شامل ہونا چاہئے جن کی علمی اور عملی طاقتیں کامل ہوں۔ اگر کوئی انسان اپنے اس فرض میں کوتاہی کرے تو وہ ملامت کا مستحق ہوگا۔ اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جسے بھوک اور پیاس لگی ہو پس اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے کو بچانے کے لئے اپنی تمام طاقت خرچ کر کے کھانے پینے کی تلاش کرے اگر وہ اس تلاش میں کمی کرے اور مر جائے تو ملامت کا حقدار ہوگا۔ حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو انسان کی طبیعت ہمیشہ یہ خواہش کرتی ہے کہ وہ ایسی جماعت میں ہو جس کی اقوام میں تعریف کی جائے اور وہ اس جماعت میں رہ کر علم و عمل میں ترقی کرے اگر اس کی طبعی طاقتیں اپنی خواہشات میں کسی وقت ایک دوسرے کی مخالف ہو جائیں تو فیصلہ اس صورت پر ہونا چاہئے جو سب صورتوں سے اچھی صورت ہو۔ ہم اس کو ہی صراط مستقیم یعنی سیدھا راستہ کہتے ہیں اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں کہ مبادا بعض ایسی حالتیں پیدا نہ ہو جائیں جو ہم کو اس راستے پر چلنے سے روک دیں۔

دُعا کی ضرورت

اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان کی ارادی طاقت اپنی پوری طاقت سے سیدھے راستے پر چلنے کا ارادہ کرے۔ پس اگر انسان کو اس بات کا خطرہ ہوگا کہ مبادا بعض ایسی حالتیں پیدا نہ ہو جائیں جو اس کو سیدھے راستے پر چلنے سے روک دیں تو انسان کی کام کرنے کی ارادی قوت کبھی بھی ہمت اور چستی سے کام نہیں کرے گی لیکن اگر اس کو ایسا خطرہ نہیں ہوگا تو وہ اپنی پوری طاقت سے کام کرے گی ایسا خطرہ اس کے دل سے اس طرح ٹل سکتا ہے کہ وہ اس سے ہی دعا مانگے اور مدد لے جس کے ہاتھ میں تمام چیزوں کی باگ ہے اور وہ اپنے ارادہ سے سب کچھ کر سکتا ہے اور وہ دعا ایسی مناسب حالت میں مانگے جس میں اس طاقت والی ذات کا زیادہ قرب نصیب ہو۔ وہ حالت نماز کی حالت ہے جس میں وہ اپنے دل کو پوری طرح پالنے والے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

وہ کونسی جماعت ھے، جس کے راستے پر چلنے کی ہم دعا مانگ رہے ھیں

اس جماعت کا بیان سورۃ نساء کی آیت ۶۹ اور ۷۰ میں اس طرح کیا گیا ہے ”اور جو کوئی حکم مانے اللہ کا اور رسول کا تو وہ ان کے ساتھ ہے جن پر اللہ نے انعام کیا کہ وہ نبی اور صدیق اور شہید

اور نیک بخت ہیں اور اچھی ہے ان کی رفاقت یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ کافی ہے جاننے والا''۔ اس بیان کے جاننے کے لئے یہ بات یاد رہے کہ انسان میں دو طاقتیں ہیں (۱) علم حاصل کرنے کی اور (۲) اس کے مطابق عمل کرنے کی یہ دونوں طاقتیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں لیکن ان دونوں طاقتوں میں سے کوئی طاقت کسی میں زیادہ ہوگی اور کسی میں کم ہوگی اسی لئے لوگ فضیلت میں ایک دوسرے سے کم وبیش ہوتے ہیں اور ان کے بیشمار اقسام ہو گئے ہیں لیکن بڑے بڑے اقسام یہ ہیں: نبی، صدیق، شہید اور صالح۔

جن کی علمی طاقت زیادہ ہوگی ان میں سے جن کی وہ طاقت چوٹی کے درجہ پر ہوگی اور وہ انسانی نوع کے امام سے علم حاصل کریں گے تو وہ انبیاء ہیں۔

جن لوگوں کی علمی طاقت انبیاء کی علمی طاقت سے دوسرے درجہ پر ہوگی اور وہ انسانی نوع کے امام سے علم حاصل کرنے میں بھی انبیاء سے دوسرے درجہ پر رہیں گے لیکن ان کی عملی طاقت انبیاء کے برابر ہوگی تو وہ صدیق ہیں۔

جن کی عملی طاقت زیادہ طاقتور ہوگی ان میں سے جن کی وہ طاقت چوٹی کے درجہ پر ہوگی اس قدر کہ اگر ان کو اپنا مطلب (بین الاقوامی تحریک کا) پورا ہوتا ہوا نظر نہیں آئے گا تو اپنے طریقہ کو لوگوں میں جاری کرنے کے لئے جنگ کرنے اور جانی اور مالی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے اور قتل ہونے کو پسند کریں گے تو یہ شہید ہیں۔

جن کی عملی طاقت شہیدوں کے درجہ سے دوسرے درجہ پر ہوگی اور وہ جانی اور مالی قربانی کے لئے بھی تیار ہوں گے لیکن شہیدوں کی طرف تیار نہ ہوں گے بلکہ اپنی تمام زندگی میں بین الاقوامی تحریک (اسلام) کو جاری کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے تو وہ صالح ہیں اس بیان کا حاصل مطلب یہ ہے کہ علم حاصل کرنے والوں اور عمل کرنے والوں دونوں کے دو درجہ ہیں پس جو لوگ بھی ان دو درجوں میں سے کسی درجہ پر چلیں گے وہ ان میں سے ہوں گے جن پر اللہ نے فضل کیا ہے اور جو لوگ ان درجوں سے نیچے گریں گے وہ یا تو مغضوب علیہم سے ہوں گے یا ضآلین میں سے ہوں گے۔

ہمارا اس دعا مانگنے سے مطلب کیا ہے؟

اس دعا کے مانگنے سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اگر زمین پر کوئی ایسی جماعت ہے جس پر تو نے نعمت کی ہے تو ہم کو اس جماعت تک پہنچا اور ہم کو اس میں داخل ہونے کی توفیق دے اگر ایسی جماعت زمین پر نہیں ہے تو ہم کو ایسی جماعت پیدا کرنے کی توفیق دے اور ہم کو اس

جماعت سے کبھی بھی نہ کر جس کی علمی اور عملی طاقتیں مذکورہ بالا درجوں سے گری ہوئی ہوں۔

اس دعا کے مانگنے کے بعد اگر ایسی جماعت زمین پر نہ ہوگی تو ہمت والوں کو اللہ تعالیٰ ایسی جماعت بنانے کی توفیق دے گا اور درمیانی سمجھ والوں اور عام لوگوں کو ہمت والے لوگوں کا مددگار بنائے گا۔ اس وقت ان لوگوں کی مثال ایسی ہوگی جس طرح بیابان میں ایک بڑا شہر بنانے کا خیال کریں۔

اس دعا کا نمونہ:

یہ بات یاد رہے کہ جس طرح کھانے کی چیزوں کے اختلاف سے اور مقوی غذاؤں اور دواؤں اور ہلکی غذاؤں کے استعمال کرنے اور نہ کرنے سے لوگوں کی ملکی اور حیوانی طاقت میں اختلاف پیدا ہوتا ہے اسی طرح مختلف ملکوں کی آب و ہوا اور رہنے سہنے کے نمونہ بدل جانے سے بھی مختلف قوموں کی ملکی اور حیوانی طاقت بدل جاتی ہے اسی لئے ہم بعض اقوام کو نہایت رحمدل دیکھتے ہیں اور بعض کو دوسری قوموں کے مقابلہ میں سخت دل دیکھتے ہیں وہ ذرا سی بات پر بھی دوسرے کا خون کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں بعض اقوام عاقبت کا زیادہ خیال کرتی ہیں اور بعض کو نتیجہ کا خیال کم ہوتا ہے پس اگر مختلف اقوام اور ممالک کے عقلمند اپنی اپنی قوم کی فطرت کو کامل کرنا چاہیں گے تو ہر ایک کو اپنی قوم کی طبیعت کے موافق کسی بھی درجہ تک جدا علمی نصاب اور عمل دستور مقرر کرنا پڑے گا پس ہر ایک قوم کے پاس سیدھے راستہ کا کچھ حصہ جدا ہوا۔

اس دعا میں ان خاص راستوں میں سے کسی خاص راستہ کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ اس کو عام رکھا گیا ہے پس ہر شخص اپنی فطرت سے اپنے پالنے والے کی طرف خیال کرے گا اور اس پر اپنی فطرت کو کمال تک پہنچانے کے لئے بھروسہ کرے گا اور اس سے اپنی فطرت کے موافق سیدھے راستے پر چلنے کی دعا مانگے گا اسی لئے اس صورت میں سیدھے راستے کے عملی طریقہ کو معین اور خاص کرنے کے لئے بڑے بزرگوں میں سے کسی بزرگ کا نام نہیں لیا گیا ہے مثلاً! یہ نہیں کہا گیا ہے کہ صراط محمد یا صراط موسیٰ و عیسیٰ بلکہ اس کو عام رکھا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ صراط الذین انعمت علیہم یعنی اے اللہ! ہم کو ان بزرگوں کا راستہ دکھا جن پر تو نے نعمت کی ہے پھر وہ بزرگ کوئی بھی ہوں اے اللہ! ہمارے لئے ایسے بزرگوں کے راستے کو خاص کرنے کا تجھ کو اختیار ہے۔ اور اسی لئے اس آیت کے آخر میں ذکر شدہ مغضوب علیہم اور ضالین کو کسی خاص قوم کے ساتھ معین اور مقرر نہیں کیا گیا ہے۔

پس جب اس دعا میں ان خاص راستوں میں سے کسی خاص راستے کا بیان نہیں کیا گیا ہے

بلکہ اس کو عام رکھا گیا ہے تو امام جس وقت نماز میں اس کو پڑھے گا اس وقت ہر ایک اس کے ساتھ آ کر شریک ہو جائے گا پس مختلف اقسام کو ایک دعا پر اکٹھا کرنا آسان ہو جائے گا۔ حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو اس جیسی دعا جس کی بنیاد انصاف پر رکھی گئی ہو دوسری کسی بھی مذہبی کتاب میں دیکھنے میں نہیں آئے گی کیونکہ اس دعا سے تمام لوگوں کو ایک حکمت پر اکٹھا کر سکتے ہیں۔

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ

اوپر گذر چکا ہے کہ علم حاصل کرنے والوں کے دو درجے ہیں۔ جو انسان ان دو درجوں سے نیچے کرے گا وہ مغضوب علیہم میں سے ہوگا اور عمل کرنے والوں کے بھی دو درجے ہیں جو ان دو درجوں سے نیچے کرے گا وہ ضالین میں سے ہوگا۔

اس لئے ہم اپنے زمانے میں مغضوب علیہم ان لوگوں کو کہتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن کی معنیٰ ظاہر ہے صاف طرح سے سمجھ میں آتی ہے لیکن اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ ضالین ان لوگوں کو کہتے ہیں جو کہتے ہیں کہ قرآن کو اس زمانہ میں کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانہ میں یہودیوں کو مغضوب علیہم اور عیسائیوں کو ضالین فرمایا ہے کیونکہ یہودیوں کے پاس توراۃ تھی وہ اس کو سمجھتے تھے اور توراۃ کے سکھانے والے انبیاء بھی ان کے پاس آتے رہتے تھے لیکن باوجود اس کے بھی توراۃ کے خلاف چلتے تھے انبیاء کو قتل کرتے تھے اور تکلیفیں پہنچاتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی اس تفسیر کو تمام زمانوں اور ملکوں کے مطابق تفسیر نہ سمجھنا چاہئے بلکہ ایک مثال سمجھنا چاہئے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھی پس ہر انسان کو چاہئے کہ پہلے اپنے وقت اور ملک کے لوگوں پر نظر کرے اس کے بعد مغضوب علیہم کی تفسیر معلوم کرے پھر دوسرے لوگوں کو ان جیسا ہونے سے روکے۔

عیسائیوں کو ضالّین اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ توراۃ اور انجیل کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے تھے بلکہ ایمان لانے پر کفایت کرتے ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ میں نے سولہ برس کی عمر میں اسلام قبول کیا اس وقت میرے پاس نہ کوئی مال تھا اور نہ کوئی میں ہنر جانتا تھا پھر علم سیکھنے کی طرف متوجہ ہوا اور عربی کے شاگردوں کو جو معمولی کھانا اور معمولی کپڑا ملتا ہے وہی مجھے ملتا تھا اس پر صبر کیا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی اور ان کے رفقاء سے جو سب دیوبند سے تھے، قرآن سیکھنا شروع کیا اس کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی (دارالعلوم) کے بانی) کی

ویب : www.hikmatequran.org ای میل : hikmatequran@gmail.com

تصانیف کی طرف متوجہ ہوا اور مجھے خبر ہے کہ ہزاروں شاگرد ان کی تصانیف کو دیکھتے اور پڑھتے تھے اس کے بعد حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے فرزند امام عبدالعزیز اور مولانا اسمٰعیل شہید (جن کی ہندوستانی علماء میں سے اکثر اہل حق عزت کرتے ہیں) کی تصانیف کی طرف متوجہ ہوا (مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ) میرا اس بیان سے یہ مطلب ہے کہ ان بزرگوں کا مقصد لوگوں سے چھپا ہوا نہیں ہے جن لوگوں نے ان بزرگوں کے طریقے اور تصانیف سے فائدہ حاصل نہیں کیا انہوں نے صرف اپنی غفلت سے کام لے کر اپنا نقصان کیا ہے (مولانا فرماتے ہیں) میں اللہ کا شکر کرتا ہوں جس نے مجھے یہ توفیق دی کہ میں نے اپنی زندگی کا یہ مقصد بنایا کہ میں ان بزرگوں کے طریقہ پر قرآن شریف کی تفسیر سمجھوں گا کیونکہ میں اپنی حالت کو اپنے خیال میں موجود سمجھتا تھا پس میں اللہ کا شکر کرتا ہوں کہ میرے پاس بہت سے عقلمندوں نے (جو مجھ سے بہت سے دینی اور دنیاوی کاموں میں زیادہ عقلمند ہیں) پڑھا اور میں نے بھی قرآن شیرف میں فکر کرنے کو اور اسکو پڑھانے کو اپنا مقصد حیات بنایا۔ اب میں کہتا ہوں کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں قرآن شریف کو کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا وہ ضالین میں سے ہیں کیونکہ جیسے قرآن شریف کے سمجھنے کی میں نے کوشش کی ایسے ان کے لئے بھی کوشش کرنا آسان تھا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ پھر مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ضالین کی جماعت میں سے بعض آدمی مہدی کے آنے کا انتظار کرتے ہیں کیا قرآن کی جو نعمت اللہ تعالیٰ نے ان کو دی ہے اس کا انہوں نے شکر ادا کر لیا ہے جو اب وہ مہدی کے آنے کا انتظار کر کے اللہ تعالیٰ کی زیادہ نعمت مانگ رہے ہیں۔

خاتمہ سورۂ فاتحہ

یہ بات جاننا چاہئے کہ مسلمانوں کے اگرچہ بہت سے فرقے ہیں اور ان کے طریقے بھی جدا جدا ہیں مثلاً ایک سُنی ہے وہ اپنے اسلام میں ایسی باتیں بتلاتا ہے جسے کوئی بھی دوسرے مذہب کا مسلمان قبول نہیں کرتا۔ دوسرا شیعہ ہے جو اپنے مذہب میں سنیوں کے مخالف باتیں داخل کرتا ہے تیسرا خارجی ہے اس کا بھی ایسا ہی حال ہے لیکن ان سب کے ہاں قرآن کو نماز میں پڑھا جاتا ہے اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ اسلام فقط قرآن شریف کی تابعدار کرنے کا نام ہے اس لئے اس کی ہی تبلیغ تمام اقوام میں کرنا چاہئے قرآن شریف کو نماز میں پڑھنے کے لئے لوگ اسکو یاد کرتے ہیں اور صحیح پڑھنے اور صحیح معنیٰ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اسی لئے اساتذہ اور مجتہدین کی جماعتیں اُٹھی ہیں جنہوں نے ہر انقلابی دور میں تحریف کو قرآن میں داخل ہونے روکا ہے۔

حضرت مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں مجھے اجتماعی تحریکوں کا تجربہ ہے لیکن جو انصاف اور حق کی

دعوت قرآن میں ہے اس کا تیسرا یا چوتھا حصہ بھی ان تحریکوں میں نہیں ہے حضرت مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ میرا مطلب اس بیان سے مسلمانوں کی تعریف کرنے کا نہیں ہے کیونکہ انہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے ان کو فقط اسلام کا دعویٰ ہے اور بڑے بڑے دعوے ہیں دوسری طرف قرآن یہ اعلان کر رہا ہے کہ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ مولانا نے فرمایا کہ مجھ پر اس آیت کا اتنا اثر ہے کہ میں نے جب اپنے شروع زمانہ میں قرآن کی طرف دعوت دینا شروع کی۔ تو اسی وقت میں نے خیال کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی مدرسہ کے بنانے کی توفیق دی تو میں اس آیت کو مدرسہ کے دروازہ پر لکھوں گا تا کہ یہ ان مسلمانوں کے لئے جواب ہو جو بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں قرآن اس زمانہ میں اس بلند درجہ پر اس لئے رہا ہے کہ اس میں باہر کی چیزوں سے کوئی بھی ملاوٹ نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی اس کے مطلب کو کوئی بگاڑ سکا ہے کیونکہ اسلامی شریعت نے نماز میں قرآن کے پڑھنے کو واجب ٹھہرایا ہے اس کے بعد اسلامی شریعت کو تحریف اور ملاوٹ سے پاک کر سکتے ہیں اور معلوم کر سکتے ہیں کہ فلان بات اسلامی شریعت کی ہے اور فلاں اس میں زیادہ کی گئی ہے اور فلاں اس سے کم کی گئی ہے۔

نماز کی حقیقت

نماز اصل میں اس بات کا نام ہے کہ انسان اپنی پوری فکر اور خیال سے اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہو اور جس چیز کی ضرورت ہو اس کے حضور میں وہ پیش کرے وہ عرض یہ ہے **اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم** پس نماز اصل میں سورہ فاتحہ کے پڑھنے کا نام ہے نماز میں سورہ فاتحہ کے پڑھنے کے بعد قرآن کی کسی سورۃ یا قرآن کے کسی حصے کو اس لئے ملایا جاتا ہے کہ جو عرض سورۃ فاتحہ میں اللہ کے آگے پیش کیا گیا ہے اس کا اللہ کی طرف سے جواب ہو کہ وہ سیدھا راستہ قرآن ہے۔ اس کے بعد رکوع اور سجدے اس لئے کئے جاتے ہیں کہ تا کہ وہ اس عرض کے قبول کرنے کے لئے شکر بنیں اور نماز کو کامل کریں۔

نماز کے لئے پہلے پاکی (طہارت) کرنا اور بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر کے کھڑا ہونا یہ نماز شروع کرنے کے وسیلے ہیں۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ نماز کی یہ حقیقت حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی کی کتابوں سے لی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ہم انسان کے اسلام کے لئے یہ بات پڑھاتے ہیں کہ **من صلی صلوٰتنا و استقبل قبلتنا و اکل ذبیحتنا فھو المسلم** (ترجمہ) "جو انسان ہماری نماز پڑھتا ہے اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرتا ہے اور ہمارے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھاتا ہے تو وہ مسلمان ہے"۔ پس اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ انسان

مسلمانوں کی جماعت میں رہ کر نماز کی حالت میں سورہ فاتحہ کے الفاظ سے اس میں بیان کی ہوئی دعا مانگے۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی فرماتے ہیں کہ کیا یہ بات لوگوں پر بھاری ہے؟

نماز پڑھنے کے وقت سورۃ فاتحہ کے معنیٰ کی طرف خیال کرنے کی آسان صورت

جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں ہم کو اپنی فطرت کو کمال تک پہنچانے کے لئے **اھدنا الصراط المستقیم** سے اللہ سے سوال کرنا تھا اس لئے اس سورت کے شروع میں ہم کو اللہ کی تعریف ان صفات سے سکھائی گئی ہے جو اس سوال کے مناسب ہیں جیسے ایک سوال کرنے والا جب کسی دوسرے انسان سے سوال کرتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ تو سخی ہے تو غریبوں، یتیموں اور عاجزوں کا خیال کرتا ہے اور ایسا کبھی بھی نہیں کہتا ہے کہ تو بہادر ہے تجھ سے تیرے دشمن ڈرتے ہیں وغیرہ۔ اسی طرح اس سورۃ کے شروع میں اللہ کے پالنے کی صفت سے شروع کر کے رحمٰن اور رحیم کی صفت بیان کی گئی ہے جن کا تعلق ماں باپ کے پالنے سے بھی ہے اس کے بعد مالک یوم الدین کی صفت بیان کی گئی ہے جس کا تعلق بادشاہ سے ہے۔ آدمی بادشاہ کے پاس اپنی ضرورت کے لئے تب جاتا ہے جب سمجھتا ہے کہ میرے ماں باپ میری اس ضرورت کے پورا کرنے سے عاجز ہیں اس کے بعد اللہ کے آگے اپنی غلامی اور عاجزی ظاہر کر کے اس کو **اھدنا الصراط المستقیم** سے سوال کیا گیا ہے۔

امین

اے اللہ! ہماری یہ دُعا قبول کر!!